تعلیم، فلسفہ اور سماج

سلامت اللہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تعلیم، فلسفہ اور سماج

تعلیم، فلسفہ اور سماج

سلامت اللہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

© سلامت اللہ

Taleem, Falsafah Aur Samaj
by
Salamatullah
Rs-83/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: فروری 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/83 روپے

ISBN: 978-81-7587-505-5 سلسلۂ مطبوعات: 1411

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہوچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آیندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست

پیش لفظ ۷

حصہ اوّل — تعلیم کی بُنیادیں

۱- تعلیم اور فلسفہ ۱۴

۲- تعلیم اور فطرتِ انسانی ۲۷

۳- تعلیم کا منصب ۴۲

۴- نوجوانوں کے مسائل ۵۴

حصہ دوم — تعلیم کے بعض اہم پہلو

۵- تعلیم اور امن و جنگ ۷۴

۶- ہماری تہذیب ۹۰

۷- قومی نظامِ تعلیم ۱۰۱

۸- شہریت کی تعلیم ۱۱۳

۹- تعلیم اور مسئلہ معاش ۱۲۹

۱۰- جمالیاتی تعلیم ۱۴۱

۱۱- سائنس کی تعلیم ۱۵۱

حصہ سوم — بنیادی قومی تعلیم

۱۲۔ بنیادی تعلیم اور سماج ۱۵۸

۱۳۔ جمہوریت اور بنیادی تعلیم ۱۷۳

۱۴۔ بنیادی قومی تعلیم کدھر؟ ۱۸۴

حصہ چہارم — ملک کے تعلیمی حالات

۱۵۔ منصوبہ بند تعلیم ۱۹۴

۱۶۔ حالیہ تعلیمی رجحانات ۲۰۴

۱۷۔ خواندگی کی رفتار ۲۱۹

۱۸۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور ناخواندگی ۲۲۸

حصہ پنجم — چند تعلیمی مسائل

۱۹۔ جذباتی ہم آہنگی ۲۳۶

۲۰۔ لسانی اقلیتوں کی تعلیم ۲۵۰

۲۱۔ مسلمانوں کی ثانوی تعلیم ۲۵۹

حصہ ششم — چند معلمین

۲۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ افکار و نظریات ۲۷۰

۲۳۔ ٹیگور بحیثیت معلم ۲۸۴

۲۴۔ بچوں کے ادیب۔ اسماعیل ۲۹۸

۲۵۔ بچوں کے شاعر۔ محروم ۳۰۶

پیش لفظ

میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیچرس کالج میں ۱۹۳۶ء میں استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا تو اُس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ تھے۔ موصوف نے توجہ دلائی کہ استادوں کے لیے اردو زبان میں موادِ تعلیم تیار کرنے کی شدید ضرورت ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ جامعہ میں تعلیم، اردو کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ مؤثر تعلیم صرف مادری زبان ہی کے ذریعے دی جاسکتی ہے۔ اس لیے اگر ہمارے کالج کے اساتذہ اردو زبان میں استادوں کی ٹریننگ سے متعلق لٹریچر تیار کریں، تو وہ ہمارے کالج کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن ٹریننگ کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ میں نے کچھ مدت کے بعد دو کتابیں مرتب کیں: "ہم کیسے پڑھائیں؟" اور "بنیادی استاد کے لیے" اور انھیں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ ان کتابوں کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہوتا

ہے کہ اردو جاننے والے استادوں نے انھیں پسند کیا ہے۔

آزادی کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جو اُردو کے لیے سازگار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں رفتہ رفتہ ایسے مدارس کی تعداد کم ہوتی گئی جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ مگر اب اُردو کے خلاف تعصب کے بادل کچھ چھٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور امید ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے وہ اُردو کے ذریعے تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ لہٰذا ایسے استادوں کو تیار کرنا ہوگا جو اُردو زبان کے ذریعے پڑھا سکیں۔ اُن کے لیے موزوں تعلیمی مواد مہیا کرنا ہوگا۔ موجودہ تصنیف اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، وہ دراصل مختلف مواقع پر اور مختلف تقریبات کے لیے لکھے گئے تھے۔ اُن میں سے بعض علمی مجلسوں اور کانفرنسوں میں پیش کیے گئے، بعض اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئے اور بعض ایسے ہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیے گئے ــــــ چونکہ مختلف مضامین میں الگ الگ قسم کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے، اس لیے پڑھنے والوں کو اندازِ بیان اور لب و لہجے میں فرق محسوس ہوگا ــــ لیکن سبھی مضمون ایسے ہیں جو نہ صرف استادوں کو بلکہ عام شہریوں کو تعلیم کے بعض مخصوص پہلوؤں سے روشناس کریں گے اور کچھ اہم تعلیمی مسائل پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیں گے۔

کتاب کا نام "تعلیم، فلسفہ اور سماج" ہے۔ جس سے کتاب کی غرض و غایت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کیا ہے؟ —— تعلیم کس لیے دی جاتی ہے؟ ایسے سوال ہیں، جن کا تعلق ایک طرف حیاتِ انسانی کے تصوّر سے ہے اور دوسری طرف کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی تقدیر سے ہے۔ اسی کو فلسفہ کہتے ہیں۔ مزید، تعلیم کا سماج سے گہرا رشتہ ہے۔ تعلیم کسی مخصوص سماج کے لیے ہوتی ہے۔ موجودہ سماج کی قدروں اور ضرورتوں سے بھی تعلیم کا رابطہ ہوتا ہے اور تعلیم، ایک نئے سماج کی تعمیر میں بھی مدد دیتی ہے تعلیم خلا میں نہیں ہوتی۔ تعلیم کسی صورت میں بھی سماج کو نظر انداز نہیں کر سکتی، کیونکہ تعلیم ایک سماجی کام ہے۔

موضوع کے لحاظ سے مضامین کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اوّل میں چار مضمون ہیں۔ یہ بعض اُن حقایق پر روشنی ڈالتے ہیں، جو تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ایک تعلیمی نظام بعض مخصوص مقاصد کو پورا کرتا ہے اور اس کا مدار فطرتِ انسانی کے تصوّر پر ہوتا ہے۔ یہاں فلسفہ، نفسیات اور عمرانیات کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ ان علوم کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے۔ ایک طرح سے انھیں تعلیم کی اساس سمجھنا چاہیے۔

دوسرا حصّہ سات مضمونوں پر مشتمل ہے اور اس میں

تعلیم کے بعض اہم پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ تعلیم کا استعمال انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ جنگ کی فضا قائم کرنے کے لیے، جو کہ نوعِ انسانی کی تباہی کا ذریعہ ہے۔ گو کہ آج دنیا مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر ایک قوم تعلیم کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہے، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم فرد کو نہ صرف ہمہ گیر انسانی اقدار سے آشنا کرے بلکہ انسانی بقا اور ترقی کے لیے عملی جدوجہد کرنا بھی سکھائے۔

تیسرا حصہ بنیادی قومی تعلیم سے متعلق ہے اور اس میں تین مضمون ہیں۔ اُن میں بنیادی تعلیم کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں کہ وہ جمہوری نظام سے کس طرح ہم آہنگ ہیں اور اُن عناصر کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو بنیادی تعلیم کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

چوتھے حصے میں چار مضمون ہیں۔ اُن میں ملک کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں منصوبہ بند ترقی کے اصول کو اپنایا گیا ہے۔ اس کا تعلیمی حالات پر کیا اثر پڑتا ہے اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی، ترقی کی رفتار میں کس طرح رکاوٹ ڈال رہی ہے۔

پانچواں حصہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے۔ یہاں چند

ایسے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو ہماری تعلیم میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جذباتی ہم آہنگی پر قومی اتحاد کی بنیاد قائم ہے۔ لسانی اور مذہبی اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کو قومی ترقی کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

چھٹے اور آخری حصے میں چار مضمون شامل ہیں۔ دو ایسے معلّمین سے متعلق ہیں جنھوں نے ملک کی ضروریات کے پیش نظر بعض ایسے تعلیمی نظریات پیش کیے ہیں جو افادی لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور رابندر ناتھ ٹیگور کے تعلیمی کارناموں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باقی دو مضمون اردو کے ایسے دو ادیبوں کے بارے میں ہیں جنھوں نے بچّوں کے لیے بہت مفید لٹریچر تخلیق کیا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی اور ترلوک چند محروم۔

امید ہے کہ اساتذہ کے لیے اور خاص کر زیر تربیت اساتذہ کے لیے مضامین کا یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا۔ انھیں تعلیم کے موضوع کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا اور تعلیم کے بعض اہم مسائل پر سوچنے کے لیے بھی اکسائے گا مجھے، انھیں کے لیے نہیں جو براہ راست تعلیم کے کام میں مصروف ہیں، بلکہ یہ مضامین عام شہریوں کی دلچسپی کا بھی باعث ہوں گے۔

جنوری ۱۹۷۴ء

(ڈاکٹر) سلامت اللہ
جامعہ نگر۔ نئی دلی

حصہ اول

تعلیم کی بنیادیں

۱۔ تعلیم اور فلسفہ

تعلیم کا منصب دراصل ان عقائد، رجحانات، خیالات، اقدار وغیرہ کی اشاعت کرنا ہے، جو کسی مخصوص سماج میں اور کسی خاص دور میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہیں یا ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں۔ حقیقتاً یہ سب ایک ہی نظامِ فکر کی حامل ہوتی ہیں، جسے علمی اصطلاح میں فلسفہ کہا جاتا ہے۔ وسیع معنوں میں دیکھیے تو کوئی بھی فلسفہ کُل کائنات کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے اور یہ متعین کرتا ہے کہ کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے۔ یہ تو ہے فلسفے کا مرکزی موضوع۔ مگر اس کے دامن میں چند نظریات ایسے ہیں جنھیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً وہ نظریات جو حقیقت، علم اور اخلاقیات کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان نظریات کی بنا پر ہی انسان کائنات میں اپنے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم معلوم کریں کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس کا علم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پانے کے لیے کون

سے مقاصد پیشِ نظر ہونے چاہییں۔

عملی لحاظ سے دیکھیے، تو فلسفے کے دائرے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ انسان کی منزلِ مقصود کیا ہے، اس کی راہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں ہیں اور انھیں کیونکر دور کیا جا سکتا ہے، انسان کی تگ و دو کا مقصد کیا ہونا چاہیے، وہ کن بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور وہ چیزیں جو آج اس کی دست رس سے باہر ہیں، کل کس طرح اس کے پنجۂ اختیار میں آ سکتی ہیں۔ غرض فلسفہ مقصدِ حیات کی محض تعبیر ہی نہیں کرتا، بلکہ ان اقدارِ اعلیٰ کا معیار بھی مقرر کرتا ہے جن کی رہنمائی میں انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جد و جہد کرنی چاہیے۔ لہٰذا فلسفہ غور و فکر اور خیال کی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتا بلکہ وہ عمل کا محرک اور رہنما بن جاتا ہے۔ اس طرح فلسفہ عمل کو بصارت عطا کرتا ہے۔ اور عمل میں بصیرت پیدا کرتا ہے، خیال اور عمل کے غیر فطری تضاد کو مٹاتا ہے اور فکر اور تجربے کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس طرح دیکھیے تو فلسفہ صرف دنیا کے مظاہر کی تشریح و توجیہ پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اُن میں بقول کارل مارکس انسانی ضروریات کے مطابق مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کا آلہ بنتا ہے۔ چونکہ تعلیم اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے، اس لیے فلسفے کے نزدیک تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اور تعلیم کے لیے فلسفہ ایک رہبر اور ہادی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

یوں تو یہ بات بہت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے کہ فلسفے کو تعلیم کی رہنمائی کرنی چاہیے، لیکن ماہرینِ تعلیم میں اس بارے میں اختلاف

رہا ہے۔ جو حضرات تعلیم کو اقدارِ اعلیٰ کا خادم بنانا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک فلسفے کی حیثیت مقدم ہے۔ وہ پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کی تشکیل کیوں کر ہونی چاہیے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم کو آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ فلسفہ دراصل تعلیمی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔ پیرو ہے نہ کہ رہبر۔ وہ فلسفے کو تعلیم کی جڑ نہیں پھول سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسفۂ تعلیم کی سی اگر کوئی چیز ہے تو وہ محض ان اصولوں کا مرتب ہے جو تعلیمی عمل سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، فلسفۂ تعلیم جہاں ایک طرف تعلیمی عمل اور تجربے سے کسبِ نور کرتا ہے، وہاں دوسری طرف وہ تعلیمی عمل کو روشنی عطا کرتا ہے۔ فلسفہ تعلیم کے لیے نظریہ مہیا کرتا ہے، جس کے مطابق تعلیم عمل کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ لیکن یہ عمل بجائے خود پرانے نظریے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک نظریے کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح نظریہ اور عمل مسلسل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ "نظریے" کا نکتہ چیں دراصل اس نظریے کی تنقید کرتا ہے، جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی طرح جو "عمل" پر تنقید کرتا ہے، اس کے پیشِ نظر ایسا عمل ہے جس میں غور و فکر کا کوئی دخل نہیں، جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے، جس کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں ہے۔ فلسفے کا کام ہے منزل متعین کرنا اور عمل کی رہنمائی کے لیے عام اصول وضع کرنا۔ جہاں تک طریقہ اختیار کرنے کا تعلق ہے، اسے تجربے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔

اگر تعلیم فلسفے کے ساتھ مناسب طور پر مربوط ہو جائے، تو وہ اُن خطروں سے خود کو محفوظ رکھ سکے گی، جو اسے عمل کی وادیٔ پُرخار میں پیش آئیں گے۔ فلسفہ ہی تعلیم کو ایک مقصد سے آشنا کرتا ہے اور اس کے لیے ایک سمت مقرر کرتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد واضح نہ ہو، تو تعلیم ایک رجعت پرست قوت بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمت، جواں مردی، وفا شعاری، مستقل مزاجی، فرماں برداری وغیرہ اپنی جگہ قابلِ تعریف محاسن ہیں۔ مگر یہی خوبیاں ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں پیدا کر دی جائیں تو متمدن سماج کے لیے عذابِ جان بن جائیں گی۔ اس لیے اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے کس قسم کے فرد کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں کس نوع کے سماج کی تعمیر کرنی ہے۔ محض تعلیمی طریقوں کو بہتر اور موثر بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ تعلیم کے مقاصد پسندیدہ نہ ہوں، تو تدریس کے اچھے سے اچھے طریقے ایسے رجحانات پیدا کر سکتے ہیں، جو ہیئت اجتماعی کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے "پبلک اسکول" کو لیجیے۔ اس کا طرۂ امتیاز اس مشہور کہاوت سے ظاہر ہوتا ہے۔ "واٹرلو کی جنگ دراصل ایٹن اور رگبی کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی۔" بے شک انگلستان کا پبلک اسکول اپنے موثر تربیتی پروگرام اور سخت ضبط کی بدولت ایسے جانباز اور بہادر فوجی لیڈر اور ہوشیار اور جابر حکمراں پیدا کرنے میں کامیاب ہوا، جنھوں نے برطانوی سامراج کی توسیع اور استحکام کی مہم کی سرغنائی کی، اور جو محکوم ممالک میں اپنی حکمت عملی کی بدولت

بہت "قابل" ثابت ہوئے۔ لیکن ان کی قابلیت کا راز یہ تھا کہ وہ محکوم قوموں کے ساتھ گھٹیا سلوک روا رکھتے، کسی قسم کے ظلم و تشدد سے دریغ نہ کرتے اور اپنے محکوموں پر اس قدر خوف و دہشت طاری کرتے کہ وہ بے چارے سر اٹھانے کی جرارت نہ کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اسکول کسی صالح اور انسانیت پرور فلسفہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کے مقاصد، طریقے، نصاب، امتحانات، وغیرہ، غرض پورے تعلیمی عمل میں بالآخر اخلاقیات کے اصول پوشیدہ ہیں۔ لہذا ہمیں ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک بہتر عالم انسانی کی تخلیق میں مددگار ثابت ہو سکے۔

فلسفۂ تعلیم دراصل سماجی نظام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایک سماج میں ایک مخصوص فلسفۂ تعلیم کارفرما ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے سماجوں میں "بہتر دنیا" کے متعلق جو تصورات حاوی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جداجدا ہیں۔ مثلاً کسی سماج کے نزدیک استقلال دائمی سب سے بڑی قدر ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت کو بہر کیف قائم رکھنا چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا سماج ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں کوئی بھی قدر قطعی نہیں سمجھی جاتی۔ وہاں قدر کی حیثیت محض اضافی ہے، جس چیز سے اپنا کام بنے، اپنی ضرورت پوری ہو جائے، تسکین قلب حاصل ہو، وہی قدر ہے، ایک سماج ایسا بھی ہو سکتا ہے، جو تغیّر کا قائل تو ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتا ہو کہ تغیّر کے ذریعے ایسی قدر ہاتھ آنی چاہیے، جس کی صحت پر

بھروسا کیا جا سکے اور جو انسانی زندگی کو سنوارنے اور بھرپور بنانے میں شمعِ ہدایت کا کام دے سکے۔ اس قسم کے سماج کو صحیح معنوں میں جمہوری سماج کہا جا سکتا ہے۔ یہاں فلسفۂ تعلیم اس بنیادی عقیدے پر مبنی ہوگا کہ "انسان تمام چیزوں کی کسوٹی ہے"۔ انسان کی شخصیت قابلِ احترام ہے اور انسان میں کمال حاصل کرنے کی بے پایاں صلاحیت موجود ہے، وہ موزوں حالات میں خوب سے خوب تر بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہ فلسفۂ تعلیم بچوں اور نوجوانوں کے اس حق کا دعوے دار ہے کہ انھیں وہ تمام وسائل اور سہولتیں میسّر ہونی چاہییں، جن کی بدولت ان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی غرض ہر اعتبار سے مکمل نشوونما ہو سکے اور وہ اپنے سماج کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور موثر رکن بن سکیں۔

فلسفۂ تعلیم کے نظریات ہمیشہ ان مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں، جو انسانی فطرت سے متعلق صحیح تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان میں فطری طور پر کیا کچھ موجود ہے، وہ کیا بن سکتا ہے اور کیا نہیں بن سکتا۔ یا یوں کہیے کہ فلسفۂ تعلیم اپنے سامنے انسان کی ترقی کے امکانات اور حدود دونوں چیزوں کو رکھتا ہے۔ اور ان دونوں کا تعین ان خصوصیات کی بنا پر کیا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر انسانی فطرت سے منسوب کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ مفروضہ کہ انسانی فطرت زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے اور اس میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی بنیاد بنتا ہے، جو تعلیم کے پرانے

چلن کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس فلسفے کے علمبردار روایت پرست ہیں، ان کا ایمان دائمی اقدار پر قائم ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اُن قدروں کو ایک باضابطہ نصابِ تعلیم اور پرانے زمانے کے آزمودہ طریقوں کے ذریعے نسلاً بعد نسلاً منتقل کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ لوگ، جو انسانی فطرت کو تغیر پذیر مانتے ہیں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں فرد اور سماج کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے اور سیکھنے کے پورے عمل میں سیکھنے والے کی شرکت فعّالی طور پر ہونی چاہیے۔

اسی طرح جب یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت میں ایک روح جلوہ گر ہے اور یہ روح مختلف قوتوں کی مالک ہے، جیسے قوتِ استدلال، قوتِ تخیل، قوتِ حافظہ وغیرہ، تو موادِ تعلیم الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعے ایک ایک قوت کی جدا جدا نشوونما ہو سکے۔ یا اگر انسانی فطرت کو ایک "صاف تختی" گردانا جائے، تو پھر سیکھنے والے پر انواع و اقسام کا تعلیمی مواد نقش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چاہے وہ اس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

انسانی فطرت سے متعلق ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ انسان پیدائشی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے اور اس حد تک کہ اس کا یہ مرض لاعلاج ہو گیا ہے۔ اس تصور نے کم و بیش قبولِ عام کی سند حاصل کر لی ہے۔ یہ بہت شرارت آمیز تصور ہے اور تعلیمی میدان نیز دوسرے سماجی میدانوں میں اس تصور کی بڑی خطرناک تشکیلیں

دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اس بات کی تبلیغ کرتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی اپنی جنت بھی کرنی چاہیے اور اگر دوسرے جہنم کے حوالے ہو جائیں تو اس سے اسے سروکار نہ ہونا چاہیے۔ اس بنا پر نہ صرف افراد کے جارحانہ عمل کی بلکہ بین الاقوامی جنگوں کی بھی تاویل پیش کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو اس قسم کے مظاہر کو جائز تک قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے اور یہ کہ فطرتِ انسانی بدلی نہیں جا سکتی، تو پھر کام کرنے کا اور کوئی محرک نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ یا تو کام کرنے کی ترغیب کے لیے انعام کا لالچ دیا جائے یا کام نہ کرنے کی صورت میں سزا کے خوف سے متاثر کیا جائے۔ بظاہر ان میں سے کوئی بھی صورت پسندیدہ نہیں ہے۔ مگر مدرسے کے اندر اور باہر ہر جگہ اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نتیجے کے طور پر تعاون کی جگہ مقابلے کی اسپرٹ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بچوں اور نوجوانوں کے درمیان رشک و حسد کا ادنیٰ جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے سرچشمے کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ مدرسہ ان خود غرضانہ رجحانات کو تقویت پہنچاتا ہے جو مقابلے پر مبنی سماج میں جاری و ساری ہیں۔

دراصل اس مفروضے کے لیے کوئی قوی جواز نہیں ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سبھی انسان اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سب کو غذا، لباس، مکان، رفاقت، محبت، وغیرہ چاہیے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ انسانی فطرت میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بے شک

یہ خواہشات فطری ہیں۔ مگر اس سے بدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ان خواہشات کو افراد باہمی کی بنا پر سماجی وسائل کی دانشمندانہ تنظیم اور تقسیم کے ذریعے خود غرضی کو فروغ دیے بغیر بحسن وخوبی پورا کیا جاسکتا ہے۔

جس چیز کو فطرتِ انسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت کوئی جامد اور مستقل شے نہیں ہے۔ وہ اُن حالات کا پھل ہے جن کے تحت انسان رہتا سہتا ہے۔ یہ حالات بہت بڑی حد تک سماجی نظام کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت اصل میں سماجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ لوگ جو اس کلیہ کے حامی ہیں، دو فریقوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ وہ دو مختلف قسم کے فلسفوں کے پیرو ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ سماج میں افراد کے تعلقات اُن کی اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق قائم ہوتے ہیں اور ان تعلقات کی حیثیت خارجی ہوتی ہے۔ یعنی وہ سماج کے داخلی عوامل سے متاثر نہیں ہوتے اور افراد سماج کی تشکیل میں آزادی اور خود مختاری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے افراد گویا خود مختار "ایٹم" ہیں، جو ایک دوسرے پر آزادی کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر ایک مرکب بناتے ہیں، جسے سماج کہا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ سماجی تصور تعلیم میں آزادیٔ عمل کے نظریے کو جنم دیتا ہے۔ اس فلسفۂ تعلیم کے نزدیک یہ قطعاً جائز نہیں کہ تعلیمی عمل میں کسی قسم کا سماجی ضبط عائد کیا جائے کیونکہ یہ فلسفہ فردکی آزادانہ نشوونما کو بہرکیف عزیز رکھتا ہے۔ تعلیم میں انفرادیت پرستی کی نظریاتی بنیاد یہی ہے اور جب اس نظریے کو عملی جامہ پہنایا

جاتا ہے، تو یہ خطرناک حد تک اس نظریہ کا مشابہ معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق انسان فطری طور پر خود غرض قرار دیا گیا ہے۔

فطرت انسانی کی سماجی اساس سے متعلق دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی فطرت بالآخر سماج کی ساخت سے متعین ہوتی ہے۔ اس نظریے کی رو سے سماج کے اندر افراد کے تعلقات داخلی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک فرد دوسرے کے ساتھ سماج کے اندرونی عوامل کی بدولت وابستہ ہے اور صرف مشترکہ مقاصد کی بنا پر ہی افراد سے سماج بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو افراد صرف اسی حد تک آزاد ہیں جتنا کہ وہ سماجی کنٹرول کی حقیقت کا صحیح شعور رکھتے ہیں اور جہاں تک وہ سماجی ارتقا کے قوانین کے مطابق اس کنٹرول میں اجتماعی طور پر تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ جو فلسفۂ تعلیم اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے وہ نہ صرف آزادی کے اس تصور کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے جائز اور پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق تعلیم کا سماجی مقصد بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بچوں اور نوجوانوں کی انفرادی نشو و نما سماجی مقصد کے تحت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے تعلیمی عمل پر سماجی ضبط عائد ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس فلسفے پر ایمان لائیں، تو پھر ہم اس تنوطیت اور کلبیت کی فضا سے باہر نکل سکیں گے جو یہ تسلیم کر لینے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔

اوپر کی بحث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کی تبدیلی ممکن ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کس حد تک بدلی جا سکتی ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ایک خاص حد سے آگے اس

میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس خیال کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر سماجی نظام کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے امکانات خود بخود محدود ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگ جو انسانی فطرت کی تبدیلی اور سماجی نظام کی تعمیرِ نو سے متعلق زیادہ پُرامید ہیں، انسان کی لامحدود ترقی میں یقین رکھتے ہیں گو کہ روزمرہ کے تجربات اور نفسیاتی جانچ کے نتائج شاہد ہیں کہ افراد کے مابین ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اور ذہنی صلاحیت ہی تمام ترقی کی جڑ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ذہانت یا سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ جو حضرات ذہانت کو ایک مستقل، مطلق اور ناقابلِ تغیر شے سمجھتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان طبقات کے سماجی اور اقتصادی سلسلۂ مدارج کے لیے جواز پیش کرتے ہیں جن میں ہمارا موجودہ سماج بٹا ہوا ہے۔ کیونکہ ان کا دعوا ہے کہ جو لوگ غیر معمولی طور پر ذہین ہوتے ہیں وہی سماجی زینے کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچتے ہیں اور کند ذہن لوگ نیچے کی سیڑھیوں پر رہ جاتے ہیں۔ ان حضرات کے طرزِ فکر میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے نزدیک ذہانت کی نشو و نما میں مواقع کی فراہمی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دوم یہ کہ وہ سماج میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے ذہانت کے علاوہ اور تمام چیزوں کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ اس نظریے کی بنا پر ہی "ذہین" طلبہ کے لیے اعلیٰ اور لبرل تعلیم اور کند ذہن طالب علموں کے لیے ابتدائی اور پیشہ ورانہ تعلیم تجویز کی جاتی ہے۔ گویا ذہن اور جسم دونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، جیسے ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جو خیال کو عمل سے اور

دماغ کو جسم سے جدا کرتا ہے اور اس طرح دونوں کو کمزور بناتا ہے' جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ در اصل یہ فلسفہ سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک تو وہ' جو صرف دماغ سے کام لیتا ہے' جو صرف سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے اور خیال کی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اپنے جسم سے کام لیتا ہے' جو محنت مشقت کرتا ہے اور انسانی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی جو فقط "خیال" کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔

عملاً ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ مادّی وسائل کے لحاظ سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' وہ تعلیم کے اچھے سے اچھے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی فطری ذہانت بڑھاتے ہیں۔ اس طرح "ذہانت" اعلیٰ سماجی مرتبے کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک بڑا چکر قائم ہو جاتا ہے اور سماج اپنی بے ڈھنگی رفتار پر قائم رہتا ہے۔

ذہانت ایک ایسی خوبی ہے جس کا "سیکھنے" سے گہرا تعلق ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ماحول کے ساتھ تعلقات قائم کرتا ہے تو ہر ایک تعلق سے اس کی جذباتی اور ذہنی زندگی پر کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اثرات ایک مدت تک قائم رہتے ہیں اور اس دوران میں جب وہ شخص اپنے ماحول کے ساتھ کوئی نئے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے' تو ان اثرات کی وجہ سے اس کے ردّ عمل میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ عمل میں ذہانت کو پرکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ذہانت کوئی پیدائشی شے ہے جو ہمیشہ ایک ہی سطح پر قائم رہتی ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ذہانت ایک سماجی شے ہے' جو عمل اور ردّ عمل کے ذریعے

برابر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ذہانت کا کتنا حصّہ موروثی ہے اور کتنا اکتسابی۔ کتنا حصّہ قدرت کا عطیہ ہے اور کتنا ماحول کی دین ہے۔

ذہانت کے اس تصوّر کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسلوں اور سماجی طبقوں کی برتری اور کمتری کا انحصار پیدائشی صلاحیتوں کی فراوانی یا کوتاہی پر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ وہ تاریخی حالات اور تہذیبی مواقع ہیں جو کسی نسل یا طبقے کے حصّے میں آتے ہیں۔ لہٰذا یہ مفروضہ کہ فطرت انسانی کو ایک خاص حد تک ہی بدلا جا سکتا ہے تعلیم کے لیے ایک چیلنج ہے کہ وہ ان حدود کو عبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ دانشمندی اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ اس وقت تک کسی حد بندی کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے، جب تک کہ اس کو پار کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت نہ ہو جائیں۔

۲۔ تعلیم اور فطرت انسانی

تعلیم کا انسان کی فطرت سے کیا تعلق ہے؟ تمام باضابطہ اور منظم تعلیم کی بنیاد بہرحال فطرت انسانی سے متعلق چند بیّن یا پوشیدہ مفروضات پر قائم ہوتی ہے۔ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے، بڑی حد تک اس بات سے متعین ہوتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کیا ہے۔ کیونکہ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آدمی کیا سیکھ سکتا ہے اور کون سی چیزیں اس کے سیکھنے کی صلاحیت سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر انسانی فطرت کے بارے میں یہ خیال کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہے یعنی یہ کہ وہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک ہی رہی ہے اور ایسی ہی رہے گی، ایک ایسے یکساں اور جامد نظام تعلیم کی پیروی کرتا ہے جس کا مقصد محض چند ہمہ گیر اور مستقل اقدار کا حاصل کرنا ہے۔ پڑھانے کے چند متعین طریقے اور بندھا ٹکا نصاب تعلیم اس نظریے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے یہ توقع رکھنا کہ یہ کبھی سماج میں تبدیلیاں لانے کا آلۂ کار بن سکے گی، محض خیال خام ہے۔ یہ تعلیم تو

حقیقتاً سماج کے تغیر پذیر تقاضوں سے بھی بیگانہ ہوگی۔ اس نظریہ کے برعکس اگر انسانی فطرت کا یہ نظریہ ہو کہ وہ اپنے احول، عہد اور مخصوص حالات سے اثر قبول کرتی ہے اور وہ ایک متحرک اور فعال چیز ہے، تو تعلیم ہر زمانے اور ہر سماج میں مختلف ہوگی اور جب کبھی سماج میں بنیادی تبدیلی آئے گی، تو تعلیم بھی اس کے ساتھ ساتھ غیر معمولی طور پر بدل جائے گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس صورت حال میں ہو سکتا ہے کہ تعلیم سماجی تبدیلیاں لانے والی قوتوں کی مدد کر کے تبدیلی کے عمل کو تیز تر کرنے میں بھی کامیاب ہو۔ یہ کام اسی وقت ہو سکے گا، جب نصاب تعلیم اور پڑھانے کے طریقوں میں ایسی مناسب تبدیلیاں کی جائیں جو طالب علموں کو اس تعلیمی پروگرام میں جس کا مقصد مطلوبہ تبدیلی کا حصول ہے، عملی طور پر شامل کر سکیں۔

آیئے، اب ہم فطرت انسانی کے بارے میں چند رائج اور مقبول تصورات پر نظر ڈالیں اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ تعلیم پر ان تصورات کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۱۔ فطرت انسانی کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ وہ ایک ازلی اور پیدائشی رجحان کے علاوہ کچھ نہیں۔ فطرت انسانی ایک جبلی شے ہے جو ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اکتساب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور نہ ہی حالات زندگی کا اس پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ فطرت انسانی کا یہ تصور بڑا مبہم ہے اس لحاظ سے کہ اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ کیا تمام بنی نوع انسان ایک مشترک فطرت کے مالک ہیں یا لوگوں کے مختلف گروہ بالخصوص

افراد متنوع فطری رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔ فطرت انسانی کی اصطلاح بسا اوقات تمام نوع انسان کے ایک مشترکہ رجحان کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے لیے آرام اور خوشی تلاش کرتا ہے اور مشکلات سے دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے یا یہ کہ وہ صرف اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھتا ہے، وہ اپنی ذات کو دوسروں پر حاوی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے، جارحانہ رجحانات کا حامل ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات نسل، مذہب اور قومیت کے اعتبار سے لوگوں کو فطری طور پر جنگ جو، مریض، کاہل یا کند ذہن گردانا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فرد کو فطرتاً ناقابلِ اصلاح اور خود بیں قرار دے دیا جاتا ہے، ان تمام صورتوں میں کسی نہ کسی چیز کو انسانی فطرت کا لازمی جزو سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر اسی نقطۂ نظر کو حقیقت پر مبنی مان لیا جائے تو مفروضہ فطرت انسانی کو نظر انداز کرنا تعلیم کے لیے ممکن نہیں ہے۔ تعلیم کو بہرحال فطرت اور میلانِ طبع کے مطابق ہی کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں۔ مثال کے طور پر اگر انسانی فطرت جنگ جو اور خود غرض ہے تو پھر یقیناً افراد اور مختلف جماعتوں کے درمیان نظر آنے والی مروجہ کشمکش اور ایک غیر صحت مند مقابلے کا ایک جواز مل جاتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں اس نظریے کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ طالب علموں کو ذاتی سرخروئی اور انعام حاصل کرنے اور تکلیف دہ مواقع سے جان بچانے کی ترغیب دی جائے۔ آج ہمارے تعلیمی اداروں

میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں انعام و اکرام کا لالچ دے کر باہمی تعاون کی بجائے مقابلے کی ایسی ذہنیت کو فروغ دیا جا رہا ہے، جو ہمارے طالب علموں میں ایک ناپسندیدہ انانیت اور حسد کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اجتماعی زندگی کے تمام سرچشموں کو زہر آلود کر دیتی ہے۔ اس طرح ہماری تعلیم ذاتی مفاد اور خود غرضی کو، جس کا آج ہر طرف دور دورہ ہے، تقویت بخشتی ہے۔

۲۔ ایک دوسرا غلط نظریہ ہے کہ فطرت انسانی ایک روح ہے، جس کے اجزائے ترکیبی تخیل، حافظہ اور استدلال جیسی چند مخصوص قوتیں ہیں۔ فطرت انسانی کے طبعی اور سماجی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے یہ نفسیاتی تصور پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل دوئی کا تصور ہے، جس میں ایک طرف ہے فطرت انسانی کا نفسیاتی پہلو اور دوسری طرف ہے اس کا طبعی اور سماجی پہلو۔ گویا کہ یہ دونوں پہلو نہ صرف ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ متضاد ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جیسے بجائے خود ان قوتوں کا کوئی اپنا وجود ہے اور جیسے اُس مواد سے اُن کا کوئی سروکار نہیں جس میں وہ بروئے کار آتی ہیں اور جن کے ذریعے ان کا ادراک ہوتا ہے۔

تعلیم میں اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مضامین کو بالکل غیر فطری طریقے پر الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک قوت کی الگ الگ تربیت ہو سکے۔ عملی طور پر ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصاب تعلیم میں ایسی بے کار چیزوں کی بھرمار ہو جاتی ہے جن کا حقیقی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

۳- ان نظریات کے علاوہ فطرت انسانی کا ایک جامد تصور ہے اس کے مطابق انسان کی فطرت ایک خالی خولی چیز ہے جس کی اپنی کوئی شکل و صورت نہیں، یہ ایک لوح سادہ ہے جس پر جو نقش چاہیے بنا دیجیے۔ اس نقطۂ نظر سے آدمی فطرتاً مجہول ہوتا ہے اور محض خارجی اسباب اور محرکات اسے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

تعلیم کے میدان میں جب اس نظریے پر عمل کیا جاتا ہے تو تعلیم اور ماحول جیسے خارجی اثرات کے ذریعے انسان کو کسی بھی سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی رہنمائی کی جائے اور اسے قابو میں رکھا جائے۔ آدمی کی آزادیٔ فکر اور خود اعتمادی سے انکار کر کے تعلیمی عمل میں اس سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے گویا وہ ایک برتن ہے جس میں کوئی چیز انڈیلی جا سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی سیکھنے کی مخصوص صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اسے ہر چیز سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ اس طریقۂ کار سے آدمی میں خود سوچنے اور سمجھنے کی عادت پیدا نہیں ہوتی اور اس طرح اس میں ہر قسم کے اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔

۴- ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ فطرت انسانی کی ایک سماجی اساس ہے۔ ہر سوسائٹی کے کسی مخصوص دور میں فطرت انسانی کا کیا مفہوم ہے، یہ بڑی حد تک سماجی اداروں کی کیفیت اور مروجہ انداز فکر سے مطابقت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آدمی کو فطرتاً متعصب اور خود غرض سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ وہ صرف اپنے اقتدار اور مفاد کا متلاشی ہے تو اس کی

وجہ صرف یہ ہے کہ مروجہ سماجی نظام کا تقاضا یہی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ فطرت انسانی درحقیقت سماجی ڈھانچے پر منحصر ہے انھیں دو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ سماج میں افراد کے باہمی رشتے خارجی اور اتفاقی ہوتے ہیں اور اس لیے وہ پائدار نہیں ہوتے۔ ہر فرد کو ایک الگ مخلوق سمجھا جاتا ہے مگر چونکہ اسے سماج میں رہنا ہے اس لیے وہ خود اپنے ارادے سے دوسروں کے ساتھ کچھ مخصوص تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بڑا میکانکی ہے، یہاں افراد خود مختار ہیں اور انھیں باہمی ردّعمل کے ذریعے ایک جماعت کی تشکیل کرنے کی آزادی حاصل ہے، جسے سماج کہتے ہیں۔ فطرت انسانی کا یہ سماجی تصور انسانی تگ و دو کے مختلف میدانوں میں جس میں تعلیم بھی شامل ہے کاروباری آزادی اور عدم مداخلت کے نظریے اور اس کے عمل کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔

اس تصور پر مبنی تعلیم کسی سماجی پابندی کو قبول نہیں کرتی اور فرد کو اپنے طور پر ترقی کرنے کی مکمل آزادی دیتی ہے۔ تعلیم میں نام نہاد انفرادیت پسندی کی یہی بنیاد ہے جس کی رو سے ہر بچے کو اپنی خواہش اور دلچسپی کے مطابق مشغلوں میں مصروف رہنے کی بے روک ٹوک اجازت ہونی چاہیے عملی طور پر یہ نقطۂ نظر خطرناک حد تک اس نظریے کے قریب آجاتا ہے جس کے مطابق انسان فطرتاً خود غرض ہے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک فطرت انسانی کا سماجی تصور یہ ہے کہ انسان کی فطرت بالآخر سماجی نظام کی بدولت متعین ہوتی ہے۔ اس نظریے کی رو سے سماج میں افراد کے رشتوں کی حیثیت داخلی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ کوئی شخص چاہے یا نہ چاہے وہ دوسروں کے ساتھ سماجی رشتوں کے ذریعے منسلک ہے۔ جب مقاصد میں اشتراک ہوتا ہے تو افراد سے سماج بن جاتا ہے، فرد ان نامیاتی قوموں کی تخلیق ہے جن سے اس کی نوع کا ارتقا ہوا ہے۔ اس کی نشوونما اپنے ہم جنسوں سے الگ تھلگ کسی خلا میں نہیں ہوئی۔ انسان کا نامیاتی ارتقا ہمیشہ اس کے سماجی ارتقا کا پابند رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق فرد اسی حد تک آزاد ہے جہاں تک وہ سماجی پابندیوں کی اصل اہمیت کو سمجھتا ہے اور سماج کی نشوونما کے اصولوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں لانے میں دوسروں کے ساتھ عمل پیرا ہے۔

اس نقطۂ نظر پر مبنی تعلیم کے نزدیک یہ امر مسلّمہ ہے کہ انفرادی نشوونما صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب اُسے سماجی مقاصد سے ہم آہنگ کیا جائے اور تعلیمی عمل صرف اسی صورت میں مؤثر ہو سکتا ہے جبکہ اس پر سماج کا قابو ہو۔

علم الانسان اور سماجی علوم کی بہت سی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم نہایت بے تکلفی سے فطرت انسانی کا نام دے دیتے ہیں وہ حقیقتاً بہت متنوع شے ہے۔ ہر تہذیب کے نزدیک فطرت انسانی کا وہی تصور ہوتا ہے جو اس کی اپنی منزلِ ارتقا سے مطابقت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر خود نمائی اور خود غرضی کے رجحانات مخصوص تاریخی حالات کی پیداوار ہیں اور ان کا اظہار بڑی حد تک ایک خاص تہذیب ہی میں ہوتا ہے۔ یہ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے ان رجحانات کو کلیتہً بنا کر دوسرے مختلف حالات پر لاگو

کریں۔ نئے اور مختلف حالات میں ان رجحانات کا ظاہر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس بات کی تصدیق عام تجربے سے بھی ہو چکی ہے اور چمپانزیوں اور بچوں پر کیے جانے والے تجربات نے بھی اس خیال کے صحیح ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں آر۔ ایم۔ یرکیز (R.M. Yerkes) کی تحقیقات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مارگرٹ میڈ (Margaret Mead) اور روتھ بینی ڈکٹ (Ruth Benedict) نے علم الانسان سے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد نتائج نکالے ہیں کہ ہوس اور جارحیت جسے جدید سماج میں فطرت انسانی کا ایک لازمی عنصر کہا جاتا ہے، بہت سے قبائل میں نظر نہیں آتی۔

یہ کہنا کہ فطرت انسانی ایک ازلی اور ابدی شے ہے اور اس کا سماجی حقائق سے کوئی تعلق نہیں، درحقیقت ایک آفاقی اور ماورائی خیال ہے۔ ایک ایسا خیال جو جیتے جاگتے چلتے پھرتے انسانوں کی زندگی سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ انسان کا ایک مجرد تصور ہے۔ فطرت انسانی کی کوئی بھی مخصوص تعریف عام طور پر چند رائج سماجی تنظیموں کا جواز فراہم کرتی ہے۔ جیسے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ رائج سیاسی اور سماجی ادارے انسانی فطرت کے بدیہی نتائج ہیں اور یہ کہ کوئی سماجی نظام جو موجودہ نظام سے بنیادی طور پر مختلف ہو کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کی اس ناکامی کا سبب محض انسان کی فطرت ہے۔ جنگیں محض انسانی فطرت کی جارحیت اور بہیمیت کی وجہ سے ناگزیر ہیں۔ ذاتی منفعت کے علاوہ

اقتصادیات کی بنیاد کسی دوسری چیز پر رکھنے کی کوشش ہمیشہ ناکام ہوگی، کیونکہ خود غرضی انسان کی سرشت میں ہے۔ انسانی فطرت کو بنیاد بنا کر اس طرح ہر نا منصفانہ فعل اور خلاف عقل کام کی حمایت کی جاتی ہے۔ یہ بات آج ہی کی خصوصیت نہیں ہے، انسان کی ساری تاریخ میں یہی ہوتا رہا ہے۔ یونانی تمدن کے دور عروج میں غلامی کو حق بجانب ثابت کیا گیا۔ قدیم ہندوستان میں چھوت چھات اور ذات پات کو ایک مقدس نظام زندگی سے تعبیر کیا گیا۔ ان دونوں کے لیے صورت جواز یہ تھی کہ کچھ لوگ فطرتاً دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کمتر اور ذلیل ہوتے ہیں۔ زمانۂ حال میں نیگرو اور یہودیوں پر جو ظلم و تشدد کیا گیا ہے، اُسے بھی بالکل اسی قسم کی بنیادوں پر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ صنعتی ترقی اور سرمایہ دارانہ سماجی نظام کی وجہ سے انانیت اور شخصی مفاد، مقابلہ اور جارحیت، انسانی سرشت کے لازم اجزا قرار پائے کہ یہی اجزا اس نظام کی اقتصادی سرگرمیوں اور اس کے سماجی ڈھانچے کے حقیقتاً پشت پناہ ہیں۔

مختصر یہ کہ فطرت انسانی کے بارے میں جو بھی نظریات اور تصورات ہیں ان کی بنیاد کسی عملی تحقیق اور حقیقی حالات کے جائزے پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس کی تشکیل میں یہ مصلحت کارفرما ہے کہ ان کے ذریعے مخصوص عملی سماجی تنظیموں کے لیے جواز فراہم ہو جاتا ہے اور پھر یہ سماجی تنظیمیں انسانی عمل پر اپنے مخصوص ڈھنگ سے

اثر انداز ہوتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ اثر اتنا گہرا ہوتا جاتا ہے کہ بعد کو غلطی سے یہی فطرت انسانی قرار پاتا ہے۔

اب تک کی گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انسان کی فطرت نہ جامد ہے اور نہ غیر تغیر پذیر، نہ یکساں ہے اور نہ عالمگیر۔ اس کے برخلاف یہ کسی سوسائٹی کے مختلف اداروں، تنظیموں اور اس کی ان تہذیبی روایات کا ماحصل ہے جو حیاتیاتی خام مواد کو انسانی فطرت میں ڈھالنے کا کام کرتی ہیں۔ اب بعض سوالات اٹھتے ہیں مثلاً ارادی کوششوں کے ذریعے انسان کی سرشت میں کس حد تک ترمیم کی جا سکتی ہے؟ فطرت اور تربیت میں کون زیادہ اہم ہے؟ توارث اور ماحول میں کس کا اثر زیادہ ہوتا ہے؟ ایک فرد دوسرے فرد سے اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے فطرت انسانی کے لحاظ سے کس حد تک مختلف ہو سکتا ہے؟ کیا کچھ نسلی، سماجی اور قومی فرقے دوسروں کے مقابلے میں فطرتاً تہی مایہ ہوتے ہیں؟

فطرت انسانی میں ترمیم کے امکانات اور حدود کیا ہیں، اس بارے میں کوئی واضح اور قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ تجرباتی مشاہدے کے ذریعے کسی نتیجے پر ضرور پہنچا جا سکتا ہے۔ مگر اس طریقے سے بھی فطرت انسانی کی تغیر پذیری کی جو حدود معلوم ہوں گی ان کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی کہ آیا یہ حدود لازمی اور مطلق ہیں یا فطرت انسانی میں ترمیم کے جو طریقے ہم نے اپنائے ہیں وہ خود اپنی جگہ کمزور اور ناکافی ہیں۔

سردست اس بات کو یہیں چھوڑ دیئے کہ تجرباتی مشاہدے کے ذریعے

انسان کی سرشت میں کیا کچھ تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ آیئے، اب ہم جائزہ لیں کہ اس مسئلے پر جو مختلف نقطہ نظر سے اپنائے جائیں گے ان کا عملی طور پر کیا اثر پڑے گا اور کیا نتیجہ نکلے گا۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ فطرت انسانی میں ایک خاص حد کے آگے تبدیلی ممکن نہیں ہے وہ درحقیقت خود سماجی نظام کی تعمیر نو کو محدود کردیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ پُر امید لوگ ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ انسان کی بہتری کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ خوب سے خوب تر سماجی نظام کی تعمیر کے لیے کوشاں رہیں گے، اور یہ لوگ وہ ہیں جن کے نزدیک اس قسم کی دلیل کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی کہ "فلاں کوشش کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو انسانی فطرت کے منافی ہے"۔ انسان مناسب اور سازگار حالات میں سب کچھ، بلا استثنیٰ سب کچھ کرسکتا ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ کسی خاص تبدیلی کے لیے ایک طویل مدت درکار ہو۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام افراد میں اصلاح و ترقی کی صلاحیت مساوی ہوتی ہے۔ آئے دن کے تجربات اور نفسیاتی تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ افراد کی ذہنی صلاحیتیں جو اصلاح و ترقی کی بنیاد ہیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرد کی ذہانت اور اس کے سیکھنے کی صلاحیت کو بڑھانا ممکن ہے؟ جو لوگ ذہانت کو ایک مطلق اور مستقل چیز سمجھتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر موجودہ سماج کی اقتصادی اور طبقاتی درجہ بندی کا جواز مہیا کردیتے ہیں۔ ان کا مفروضہ یہ

ہے کہ سماج میں جو بلندیوں کو چھونے والے لوگ ہیں وہ زیادہ ذہین ہیں اور جن کا شمار نچلے طبقے میں ہوتا ہے وہ در اصل ذہنی لحاظ سے پست ہیں۔ اس خیال سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اوّل الذکر کے لیے اعلیٰ تعلیم اور آخرالذکر کے لیے حرفتوں اور دستکاریوں کی تربیت کا انتظام کرنا مناسب ہوگا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ تعلیم کے بہترین مواقع بلا شرکت غیرے ان لوگوں کی جاگیر بن جاتے ہیں جو اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ صرف یہی لوگ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔ "ذہانت" اور "مواقع" کو ایک ہی چیز یا ہم معنی سمجھ لیا جاتا ہے اور ذہانت کے بیش و کم کا انحصار سماج میں حیثیت اور رتبے پر ہو جاتا ہے۔ ان سب سے ایک ایسا بُرا چکر وجود میں آجاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور "موجودہ حالت" کو قائم رکھنے میں معاونت کرتا ہے۔

ذہانت کا یہ تصور طبقاتی تفریق اور سیاسی جبریت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ چیز بنیادی طور پر جمہوریت کے منافی ہے۔ ذہانت کا اظہار در اصل کسی سیکھے ہوئے عمل کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہر ایک رشتہ جو فرد اور اس کے ماحول کے مابین قائم ہوتا ہے فرد کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب فرد نئے حالات میں پھر کبھی ویسے ہی رشتے سے دوچار ہوتا ہے تو وہ پہلے کے مقابلے میں یقیناً زیادہ صحت اور کامیابی کے ساتھ اس سے نپٹتا ہے۔ عملی طور پر ذہانت کی شناخت اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ ذہانت کوئی مستقل حیاتیاتی شے نہیں۔ یہ ایک تغیر پذیر سماجی چیز

ہے۔ فطرت اور تربیت، توارث اور ماحول کے درمیان کوئی واضح خطِ فاصل نہیں کھینچا جا سکتا اور اگر یہ سچ ہے تو پھر نسلوں، قوموں یا سماجی طبقوں کی برتری یا کمتری کا سبب ان کے حیاتیاتی ورثے میں مضمر نہیں بلکہ اسے ان کے تاریخی اور ثقافتی ماحول میں تلاش کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ خیال کہ فطرت انسانی میں ایک خاص حد سے آگے ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں، بنی نوع انسان کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہماری منظم کوششوں کا رُخ ان ہی مفروضہ حدود کو پار کرنے کی طرف ہونا چاہیے اور ہر حد کے وجود سے اس وقت تک انکار کرنا چاہیے جب تک کہ اسے پار کرنے کی بہترین کوشش ناکام ثابت نہ ہو چکی ہو۔

اگر تعلیم کو اس کے وسیع معنوں میں لیا جائے اور اس میں ان تمام اثرات کو شامل سمجھا جائے جو انسانی کردار کو بدلتے رہتے ہیں تو تعلیم انسانی فطرت کی تبدیلی میں اہم حصہ لے سکتی ہے۔ اس وقت دنیا کے سامنے تین اہم مسائل ہیں اور یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ ان مسائل کا سبب فطرت انسانی میں پوشیدہ ہے۔ یہ تین مسئلے ہیں جنگ، مقابلے پر مبنی اقتصادی نظام اور نسل، فرقے یا قوم کے نام پر نوع انسان میں تفریق و امتیاز۔ ان سب مسائل سے نپٹنے میں تعلیم بہت مدد دے سکتی ہے بشرطیکہ تعلیم کو محض روایت اور ڈھرے کا پابند نہ بنایا جائے بلکہ اس کی سمت مقرر کرنے میں کافی سوجھ بوجھ اور بصیرت سے کام لیا جائے اور مناسب منصوبہ بندی کی جائے۔

تعلیم کی سب سے پہلی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرے۔ جنگوں سے نجات مل سکتی ہے اگر لوگوں کو باخبر کیا جائے کہ کوئی نسل، کوئی قوم، یا کوئی سماجی گروہ فطری طور پر جنگ جو واقع نہیں ہوا ہے۔ جنگ کی چنگاری انسانی سرشت میں پوشیدہ نہیں جنگ کی آگ انسانوں کے درمیان لگائی جاتی ہے۔ خوش حالی اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے جنگ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ پُرامن دنیا میں انسان اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لوگوں کو یہ احساس دلایا جا سکتا ہے کہ خود غرضی اور انانیت انسانی فطرت کا کوئی لازمی عنصر نہیں ہے اور یہ کہ موجودہ سماج میں تنازع للبقا کے تقاضے نے خود غرضی کے رجحانات کو فروغ دیا ہے اس لیے باہمی تصادم اور مقابلے پر موجودہ اقتصادی نظام کو ناگزیر سمجھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ باہمی تعاون والے کاموں میں لوگوں کو جتنا شریک ہونے کا موقع ملے گا ان سے انھیں اتنے ہی زیادہ فوائد حاصل ہوں گے اور وہ اتنی ہی شدّت سے نہ صرف اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ موجودہ لوٹ کھسوٹ والے سماجی نظام کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ ہر لحاظ سے پسندیدہ بھی ہوگا اسی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی نسلی، فرقہ دارانہ اور قومی کشیدگی اور منافرت کا مقابلہ بھی مناسب تعلیم کے ذریعے کیا جا سکتا ہے اگر لوگوں کو یہ محسوس کرا دیا جائے کہ دنیا کے تمام لوگوں کے مسائل اور ان سب کی آرزوئیں یکساں ہیں تو غیر محفوظ ہونے کا احساس اور باہمی تعصبات بہت کم ہو جائیں گے۔

مگر یہ سمجھنا کہ تعلیم تن تنہا یہ سب کچھ کر سکتی ہے، ہماری سادہ لوحی ہو گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے تمام تہذیبی، سماجی اور سیاسی قوتوں کو جد وجہد کرنی ہو گی۔ تعلیم کا کوئی منصوبہ اس وقت تک ایسے انسان نہیں پیدا کر سکتا جنھیں نہ تو خوف زدہ رہنے کی ضرورت ہو اور نہ ہی جنگ وجدل کی خواہش، جب تک کہ وہ سماجی اور اقتصادی نظام جس کے تحت انھیں اپنی زندگی گزارنی ہے، ایسی صورت حال کے لیے سازگار نہ ہو۔

۴۔ تعلیم کا منصب

تعلیم کیا ہے؟ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ ایسے سوالات ہیں جو ہر ملک میں اور ہر دَور میں انسان کو دعوتِ فکر دیتے رہتے ہیں۔ مگر کہیں بھی اور کبھی بھی ان سوالوں کے جواب پر اتفاقِ رائے نہیں ہوا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تعلیم انسانی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اور چونکہ زندگی کے مختلف تصورات ہیں، اس لیے تعلیم کے معنی و مقصد میں اختلاف کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر اگر زندگی کو مایا جال، بھرم اور دھوکا سمجھا جائے، تو تعلیم کا مقصد اس بے ثبات زندگی سے نجات حاصل کر کے حیاتِ جاوداں کی تلاش ہوگا۔ اور اگر اس کے برعکس زندگی کو ایک حقیقت تصور کیا جائے تو پھر تعلیم اُسے تمام مادّی امکانات سے لطف اندوز ہونے کے وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے گی۔ غرض، تعلیم کے مقاصد کا اختلاف در اصل آئینہ دار ہے اس اختلاف کا جو لوگوں میں حیاتِ انسانی کے تصور سے متعلق پایا جاتا ہے۔

پھر بھی عملاً ہر جگہ اور ہر زمانے میں تعلیم کا ایک مخصوص منصب

اور اس کا ایک معین کردار رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی طبقہ یا فرقہ پورے سماج پر حاوی رہا ہے۔ اور اس نے اس قسم کی تعلیم دی ہے، جو اس کے اثر اور اقتدار کو قائم رکھنے میں ممد و معاون ہو سکے۔

"سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری"

کی بجائے یہ کہنا زیادہ جاسِ ہوگا کہ

"سلطنت طبقات غالب کی ہے اک جادوگری"

اور اس "جادوگری" میں تعلیم کی حیثیت ایک آلۂ کار کی سی ہے چاہے یہ تعلیم باضابطہ ہو، جو مکتبوں اور مدرسوں میں منظم طور پر دی جاتی ہے۔ یا بے ضابطہ ہو جو گھر، بازار اور پورے سماجی ماحول میں غیر رسمی طور پر ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔ سماج میں جو جماعت برسرِ اقتدار ہوتی ہے۔ اس کے عقائد، رجحانات، اقدار اور نظریات پورے سماج میں جاری و ساری ہوتے ہیں اور وہ تمام لوگوں کے نزدیک مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں، گویا وہ ابدی اور آفاقی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی خلاف ورزی کرنا جرم یا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ حضرات، تو ان عقائد، اقدار وغیرہ کو صحیح سمجھتے ہی نہیں، جنھیں ان سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اور جو ان کی بدولت سماج میں اپنے اقتدار کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ان پر ایمان رکھتے ہیں، جو خود مظلوم اور ستم زدہ ہیں۔ شاید اسی کو کہتے ہیں: "جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔" وضاحت کے لیے ایک مثال ہوگی۔ کسی جمہوریت پسند، روشن خیال نوجوان نے جس کے باپ ایک بڑے

زمیندار تھے، اپنے ایک ملازم کو جو ذات کا چمار تھا، انسانی مساوات کا عملی سبق دینا چاہا۔ یہ ملازم چبوترے کے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا اور یہ صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بھئی اس پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔" ملازم بولا " نہیں حضور، میں آپ کے برابر ہرگز نہ بیٹھوں گا کیونکہ پرماتما نے ہم کمینوں کو پیشاب خانے کی گندی مٹی سے بنایا ہے اور آپ جیسے اونچی ذات کے لوگوں کو گنگا جی کی پوتر مٹی سے۔ بھلا ہم آپ کی برابری کیسے کرسکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو جا پاپ ہوگا اور پرماتما ہمیں اس کی سزا دے گا۔" یہ عقیدہ دراصل اونچی ذات کے لوگوں کا ہے۔ اور ان کے تفوق کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اس عقیدے کے تقدس پر ان کا بھی ایمان ہے، جو اس ہی کی وجہ سے ذلیل و خوار ہیں۔

تعلیم دراصل تہذیبی سرمایے کی منتقلی کا عمل ہے۔ جن ذرائع اور وسائل کی مدد سے کوئی سماج اپنے تہذیبی ورثے کو ایک نسل سے دوسری نسل کے سپرد کرتا رہتا ہے، وہ سب کے سب معلم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں ریڈیو، اخبار، سینما، جلسے، جلوس وغیرہ نے تعلیم کے میدان میں بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ان کے ذریعے تہذیبی عناصر کو بہت مؤثر انداز میں لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اگرچہ گھر اور خاندان، برادری اور مذہبی جماعتیں اور اسی قسم کے دوسرے ادارے بھی جن سے فرد کا گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے، اپنے اپنے طور پر تعلیم کے کام میں برابر لگے ہوئے ہیں لیکن اب ان کا اثر تعلیم کے اداروں کے مقابلے میں کم ہوتا جا رہا ہے، جن کی تنظیم بڑے

پیمانے پر ریاست اور دوسری طاقت ور ایجنسیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔
اس لحاظ سے دیکھیے تو مدرسے کا رول سب سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔
سماج، تہذیب اور مدرسہ تینوں ایک رشتے میں منسلک ہیں۔
آیئے، اب ذرا اس رشتے کی روشنی میں تعلیم کی غرض وغایت۔ اور اس کے حدود و امکانات پر تفصیل سے غور کریں۔ اگر کسی سماج کی تہذیب تغیر پذیر نہ ہو، اس میں نمو کی صلاحیت نہ ہو، وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مدرسہ وہی مواد ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتا رہے گا۔ تعلیم ان ہی قدروں کی ترویج و اشاعت کرتی رہے گی، جن سے وہ تہذیب عبارت ہے اور وہ اُسی طبقے کے تسلط کو مستحکم بناتی رہے گی جو سماج پر غالب ہے۔ مگر شاید ہی کوئی ایسی تہذیب ہوگی جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ وہ تہذیبیں بھی جو بظاہر ساکن و جامد معلوم ہوتی ہیں اور جن کا تعلق دور افتادہ مختصر سی جماعتوں سے ہے رفتہ رفتہ بدل رہی ہیں مثلاً بحرِ پیسفک کے بعض چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بسنے والوں کی تہذیب یا ہندوستان کے بعض قبائل جیسے بھیلوں کی تہذیب بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ بعض تہذیبوں میں تبدیلی کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ اس کا احساس نہ تو خود اس جماعت کو ہوتا ہے، اور نہ ان جماعتوں کو جن کی تہذیب بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔
بہرکیف تبدیلی کے قانون کی گرفت سے کسی تہذیب کو مفر نہیں ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"

جب کل کائنات میں تغیر کا عمل جاری و ساری ہے تو بھلا کوئی چیز اپنی حالت پر ہمیشہ کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ طبقات غالب تہذیب میں کسی بنیادی تبدیلی کے قائل نہیں کہ وہ ان کے تفوق کے منافی ہے۔ تاہم تہذیبی عناصر میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک بے پناہ تخلیقی قوت کا مالک ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان خود محشر خیال ہے۔ اس کی کرشمہ سازیاں لامحدود ہیں۔ وہ ستاروں پر کمندیں پھینکتا ہے۔ نئی زمین اور نئے آسمان پیدا کرتا ہے۔ ہر ایک سماج میں ایسے ذہین، دور اندیش اور باعمل افراد پیدا ہوتے ہیں، جو تہذیب کی مادی اور نفسیاتی بنیادوں میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بنتے ہیں ؎

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی فرد کی بدولت کوئی ایسی ایجاد یا کوئی ایسا انکشاف بروئے کار آتا ہے کہ اس سے تہذیب کے مادی پہلو میں انقلابی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اور پھر یہ تہذیب کے غیر مادی، نفسیاتی یا اخلاقی پہلو میں بھی ہلچل پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کی جاگیردارانہ تہذیب کو لیجیے۔ اس کی جڑوں کو اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب نے ہلا دیا۔ اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ تہذیب وجود میں آئی۔ اس کی تہذیب کی بنیاد دراصل ان ایجادات اور انکشافات پر قائم تھی، جو صنعت اور تجارت کے میدان میں اس زمانے میں رونما ہوئیں۔ بھاپ کی طاقت کا انکشاف طرح طرح

کی مشینوں کی ایجاد کا باعث بنا۔ اس سے صنعتی پیداوار کو اس قدر فروغ ہوا کہ جو اس سے پہلے انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ اس تبدیل شدہ صورت حال میں جاگیردارانہ تہذیب کے عقیدے، قدریں اور غور و فکر کے طریقے برقرار نہیں رہ سکتے تھے۔ سائنس کی روشنی نے نہ صرف ذہن انسانی کو توہم پرستی کی تاریکی سے نجات دلائی بلکہ صدیوں کے رسم و رواج کے ان بندھنوں کو توڑنے میں مدد دی، جن میں انسان جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے گرفتار تھا۔ غلامی اور اطاعت شعاری کی جگہ آزادی اور خود شناسی نے لے لی۔ اور یہ قدریں نئی تہذیب کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ چنانچہ تعلیم کے میدان میں کئی تحریکیں ان اقدار کی علمبردار نظر آتی ہیں، اور یہ سرمایہ دارانہ سماج کی تہذیب کے توانا عناصر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ "ترقی پسند تعلیم" کے حامیوں کا سلسلہ یورپ میں روسو سے شروع ہو کر امریکا میں ڈیوی تک پھیلا ہوا ہے۔ ان تمام مفکرین اور معلمین کے درمیان جو سب سے بڑی قدر مشترک ہے وہ ہے فرد کی آزادی۔

موجودہ دور میں سماج کی تہذیب کا رنگ روپ بدلنے کا ایک اور طاقت ور آلہ انسان کے ہاتھ آگیا ہے۔ وہ ہے "ذرائع رسل و رسایل اور وسائل نقل و حمل کی غیر معمولی فراوانی اور دستیابی"۔ آج جمہوریت، آزادی اور مساوات کے تصورات محض مغربی تہذیب کا اجارہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ تمام نوع انسانی کی ملکیت بن گئے ہیں۔ جن افریقی و ایشیائی قوموں کو کل تک غیر مہذب اور وحشی سمجھا جاتا تھا، آج وہ ان تصورات سے سرشار ہو کر خود آگہی کی منزل

پرگامزن ہیں۔ اور یہ قدریں اب ان کی تہذیب کا بھی حصہ بنتی جا رہی ہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہوجانی چاہیے کہ ہر ایک تہذیب متعلقہ سماج کے مادی حالات اور نفسیاتی کیفیات میں تغیر واقع ہونے کی صورت میں خود بخود بدل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم کا نقشا بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا تعلیم کا منصب یہ ہے کہ وہ سماج کی موجودہ تہذیب کو برقرار رکھنے اور اسے تقویت پہنچانے کا محض آلۂ کار بنے یا وہ تہذیب میں پسندیدہ اور ضروری تبدیلیاں لانے کا ذریعہ بھی ہو۔ غالباً یہ سوال ان لوگوں کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا جو تعلیم کو تہذیب کی داخلی کش مکش سے الگ رکھنے کے حامی ہیں جو اقدارِ مطلق کی بات کرتے ہیں اور جن کا کہنا ہے کہ تعلیم کو ہمیشہ ان اقدارِ اعلیٰ کا خادم ہونا چاہیے جو دوامی ہیں یعنی جو زمان و مکان کی پابند نہیں۔ جو ہر ایک دور میں اور ہر ایک جگہ یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال ہے کہ تعلیم کو سماج کے مخصوص معاملات میں غیر جانب دار ہونا چاہیے۔ مگر غور سے دیکھیے تو عملاً یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم دراصل ایک سماجی عمل ہے۔ اور اسی لیے سماج کے مخصوص حالات کا تعلیم میں پڑتو ہونا لازمی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آج ساری دنیا کا تمدن ایک ہوتا جا رہا ہے اور اس وجہ سے ہر ایک متمدن سماج کی اصل قدریں ایک ہی ہیں، تو بھی ہم کسی سماج کے موجودہ تہذیبی سرمائے کو اس سماج کی تعلیم کے کام میں نظرانداز نہیں کر سکتے، اس لیے

کہ تعلیم کا بنیادی موضوع یہی ہے۔ لہٰذا تعلیم کے منصب سے متعلق جو سوال اوپر اٹھایا گیا ہے، وہ ایک حقیقی سوال ہے اور اسے یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ تعلیم جیسی مقدس شے کو سماج کے اندرونی خلفشار میں ملوث نہیں ہونا چاہیے یعنی اسے ان اختلافات میں نہیں پڑنا چاہیے جن سے تہذیب دوچار ہو رہی ہے۔ تعلیم کسی صورت میں بھی ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔

تعلیم کا تاریخی رول تو یہ ہے کہ وہ سماج کی تہذیب کو قائم رکھنے اور اس کو استحکام پہنچانے کا کام کرتی ہے۔ کسی تہذیب میں جن اقدار کا سکہ چلتا ہے، جن عقائد کا غلبہ ہوتا ہے یا جن رجحانات کی کارفرمائی ہوتی ہے، تعلیم معمولاً ان ہی کی پیروی کرتی ہے۔ لہٰذا تعلیم اکثر و بیشتر تغیر و تبدل کی حامی نہیں بلکہ قدامت پرستی کی آلۂ کار ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم کی باگ ڈور جس طبقے کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس کا مفاد وابستہ ہوتا ہے موجودہ نظام کے ساتھ۔ اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ موجودہ صورت حال قائم رہے۔ اگر اس حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے تو اس طبقے کے اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اگر تعلیم کے اس رول کو اٹل سمجھ لیا جائے تو اس کا دامن بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ توقع کرنا بے معنی ہے کہ تعلیم کبھی سماج میں تبدیلی یا اصلاح کرنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں تعلیم لکیر کی فقیر ہوگی اور بس۔ مگر ہر ایک سماج میں لازمی طور پر تعلیم کا اتنا محدود کام نہیں ہوتا۔ اگر سماج پر کوئی مطلق العنان شخص یا

جابر طبقہ مسلط ہو جائے، تو بات اور ہے کیونکہ وہاں کی تعلیم حکومت کے شکنجے میں اس قدر بے بس ہوتی ہے کہ ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتی لیکن ایک ایسے سماج میں جہاں کسی قدر جمہوریت کا نام لیا جاتا ہے جہاں افراد اور جماعتوں کو اپنی بات کہنے اور سمجھانے کی کچھ آزادی حاصل ہے، جہاں موجودہ سماجی نظام میں اصلاح اور تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے کی قدرے اجازت ہے، وہاں تعلیم یقیناً ایک تعمیری اور تخلیقی قوت ہو سکتی ہے مگر اس صورت حال میں بھی تعلیم بذات خود انقلاب کا بیڑا نہیں اٹھا سکتی. کیونکہ بہرحال تعلیم ایک ایسا سماجی کام ہے جس کا تعلق پورے سماج سے ہے، اس کے تمام طبقوں سے، جماعتوں سے اور فریقوں سے ہے۔ اور اسی لیے جب تک سماج میں کسی مخصوص اصلاح یا خیال کا کافی چرچا نہ ہو، اور جب تک اس کے حق میں معتدبہ رائے عامہ نہ ہو اور جب تک اس کی پسندیدگی اور قبولیت کے لیے کوئی جماعت یا خاص تعداد میں لوگ منظم طور پر کوشاں نہ ہوں، مدرسہ تن تنہا اس اصلاح یا خیال کی ترویج و اشاعت کا کام نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا، تو اس سے مدرسے کے باضابطہ کام میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ مثال کے طور پر اب سے پچاس سال پہلے ہندوستان کے دیہات میں اونچ نیچ کے خیال اور چھوا چھوت کو تہذیب کا ایک مسلّم جزو سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت مدرسے کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اچھوت بچوں کو اونچی ذات کے بچوں کے ساتھ ساتھ تعلیم دے سکے۔ اور خاص طور پر ان کے کھانے پینے کا مشترک انتظام کر سکے۔ اور اس رسم کو جو سراسر نا انصافی پر

چھوت چھات ختم کرنے میں پیش قدمی کر سکے۔ اور انسانی مساوات کا عملی درس دے سکے۔ اگر مدرسہ ایسا کرنے کی جرأت کرتا، تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ لیکن آج حالات بہت بدل گئے ہیں۔ اگرچہ اب بھی اس ملک میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں، جو چھوا چھوت کو اپنے ایک مذہبی عقیدے کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں، تاہم سماج کے اندر چھوا چھوت کے خلاف رائے عامہ کا قابلِ لحاظ اثر دکھائی دیتا ہے اور بعض منظم تحریکیں اسے ختم کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ لہٰذا مدرسہ اس سماجی اصلاح کی مہم میں نظری اور عملی دونوں اعتبار سے شرکت کر سکتا ہے۔ یعنی مدرسے میں طالب علم کو نہ صرف نصابی کتابوں کے ذریعے سے چھوا چھوت کی لغویت کا احساس دلایا جا سکتا ہے، بلکہ مدرسے کے تمام مشاغل میں سب بچوں کو بلا امتیاز ذات پات، برابری کا درجہ دیا جا سکتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر مدرسہ آج اس پسندیدہ تحریک میں حصہ نہ لے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ سماج کے قدامت پسند عناصر کی پیروی کر رہا ہے۔ اور اپنے ایک ضروری فرض کی ادائیگی سے غفلت برت رہا ہے۔ اس طرح دیکھیے، تو تعلیم کا ایک تعمیری اور تخلیقی رول بھی ہے کہ وہ تہذیب کو فرسودہ عقیدوں سے نجات دلانے اور صحت مند قدروں سے مالا مال کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ البتہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی سماجی نظام میں فکر و عمل کی آزادی کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیم کے تعمیری اور تخلیقی رول کے اجاگر ہونے کے امکانات اسی قدر ہوں گے، جتنی کہ عام طور پر لوگوں کو آزادی حاصل ہوگی۔

اوپر کی بحث سے تعلیم کی حدود اور امکانات دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے تعلیم کے اس رومانی تصوّر کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے جس کے مطابق تعلیم سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کو فرشتہ اور دنیا کو جنّت بنادے۔ مگر دوسری طرف یہ چیز بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم سے بجا طور پر کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم تعلیم کے اس منصب کو تسلیم کرلیں تو جنّت کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے بجائے ہمارے قدم ٹھوس زمین پر ہوں گے اور حیاتِ انسانی کو سنوارنے اور خوب تر بنانے کے لیے ہمارے سامنے خاصا وسیع میدان ہوگا۔

تعلیم کا مندرجہ بالا نظریہ حقیقت میں ایک اجتماعی نظریہ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کی تعلیم میں انفرادیت کی نشوونما کے لیے کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اس کا دارومدار اس تہذیب کے کردار پر ہے جس کی خدمت میں تعلیم مشغول ہے۔ اگر تہذیب نسبتاً جامد اور بے لوچ ہے، تو تعلیم افراد کی امتیازی صلاحیتوں سے بے نیازی برتے گی۔ اس لیے کہ اس تہذیب کے تمام اجزائے ترکیبی ایک معیّنہ شکل رکھتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کیا کیا جاسکتا ہے اور کیا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس قسم کی ایک تہذیب کو لیجیے، جس میں موسیقی یا رقص کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا گیا ہے۔ تو تعلیم افراد کی ان مخصوص صلاحیتوں کو نظرانداز کرے گی۔ مدرسہ یہ نہیں کرسکتا کہ ان طالب علموں کے شوق کو اُبھارے، جنھیں موسیقی یا رقص سے فطری لگاؤ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی تہذیب تبدیلیوں

کو قبول کرنے پر مائل ہے، تو وہاں تعلیم انفرادی خصوصیات کو فروغ دینے کا اہتمام کرے گی۔ اس لیے کہ یہ عمل نہ صرف افراد متعلقہ کی ذاتی تسکین اور سرخ روئی کا باعث ہوگا، بلکہ اس سے اجتماعی تہذیب بھی فیض یاب ہوگی۔ موجودہ سماج تو افراد کی تخلیقات سے فائدہ اٹھائے گا ہی، آیندہ نسلیں بھی اُن سے کسب نور کریں گی۔ اور اس طرح تہذیب میں ایک خوش آیند باب کا اضافہ ہوگا۔ اور اس میں ترقی کے امکانات برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا اس کے باوجود کہ تعلیم ایک سماجی عمل ہے، یہ لازمی طور پر انفرادیت کے منافی نہیں ہے، بلکہ ایک تغیر پسند تہذیب کے اندر تعلیم، فرد کی تخلیقی قوت کو پروان چڑھا سکتی ہے۔

۴۔ نوجوانوں کے مسائل

کہتے ہیں کہ فرد کی زندگی کی کسی اور منزل پر اتنے پیچیدہ مسائل نمودار نہیں ہوتے جیسے کہ عنفوانِ شباب کی منزل پر۔ والدین اور اساتذہ دونوں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں خاص قسم کی دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس منزل پر کوئی غیر معمولی تبدیلی یک دم رونما ہو جاتی ہے۔ نشوونما کا عمل ایک مسلسل اور اٹوٹ عمل ہے اس کی مختلف منزلوں کے درمیان کوئی بیّن حد فاصل نہیں ہے کہ ایک منزل یہاں ختم ہوئی اور دوسری وہاں شروع ہوئی۔ ہر ایک منزل دوسری منزل میں رفتہ رفتہ مدغم ہو جاتی ہے۔ مگر ہر ایک منزل دوسری سے اپنی خصوصیات کی بنا پر ممیز کی جا سکتی ہے۔ اور یہ خصوصیات مخصوص مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ ان مسئلوں کا جاننا اور سمجھنا ان لوگوں کے لیے بہرحال ضروری ہے جن کے ذمے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا کام ہے۔ اس اہم کام کا ایک بڑا حصہ استاد کے ذمے ہوتا ہے۔ یوں تو نشوونما کی ہر منزل کے مسئلے استاد کی توجہ

کے مستحق ہیں، لیکن عنفوانِ شباب کے مسائل اس کے خاص غور و فکر کے محتاج ہیں اس بات کی اہمیت اس لیے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس منزل کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ جن کا حل کرنا تو دور کی بات ہے ان کا ذکر کرنا تک ہماری موجودہ تہذیب میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عنفوانِ شباب زندگی کا وہ عبوری دور ہے، جو بچپن اور بلوغ کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس وقت فرد کو نہ تو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ بالغ ہی۔ اگرچہ ابھی اس میں بالغ کی سی پختگی نہیں ہوتی، تاہم اب اس کے ساتھ بچے جیسا سلوک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسے بالغ کی طرح ذمے دار اور خود مختار قرار دیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر زندگی کی اس منزل کو ایک مخصوص عمر کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دور تیرہ اور اُنیس سال کے درمیانی وقفے یعنی سات سال پر مشتمل ہے۔ مگر ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اس منزل کی حد بندی اس طرح نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے نزدیک اس کا تعلق محض جسمانی شواہد سے نہیں، بلکہ کسی قوم کے سماجی حالات سے بھی ہے۔ اگر ایک سماج میں فرد کو بالغ کی ذمے داریاں دیر میں سپرد کی جاتی ہیں تو وہاں عنفوانِ شباب کا دَور دیر تک قائم رہتا ہے مثلاً امریکہ میں اب تقریباً چوبیس پچیس سال کی عمر تک فرد پر خاندانی ذمے داریاں عاید نہیں ہوتیں اور وہ اس زندگی کی تیاری کے لیے مختلف قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں

مصروف رہتا ہے۔ اس لیے وہاں عنفوانِ شباب کی منزل چوبیس پچیس سال کی عمر تک جاری رہتی ہے۔ ہمارے سماجی نظام میں بلوغیت کی ذمے داریاں نسبتاً کم عمری میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد جو بچے ثانوی مدرسے میں داخل ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر اپنے عنفوانِ شباب کا دَور وہیں ختم کرتے ہیں۔ اس لیے اس دَور کی امتیازی خصوصیات اور مسائل کا علم ثانوی مدرسے کے استادوں کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اس منزل میں فرد طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گویا ایک نئے جسم اور ایک نئے ذہن کا جنم ہوتا ہے۔ وہ تمام تبدیلیاں جو اس وقت اس کے جسم، ذہن اور اخلاقی تصورات میں پیدا ہوتی ہیں، انواع واقسام کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔

جسمانی اعتبار سے دیکھیے تو اس دَور میں قد، وزن، شکل و صورت، آواز اور جسم کی اندرونی بناوٹ میں نمایاں تغیرات نظر آتے ہیں۔ جب عالمِ شباب کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں تو نشوونما کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے، بعض کا قد تو ایک ایک سال کے اندر چھ چھ انچ تک بڑھ جاتا ہے اور بعض کے وزن میں بیس بیس تیس تیس پونڈ تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی تبدیلی سے نہ صرف نوجوان مختلف قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے والدین کو بھی طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس زمانے میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لیے مزید غذا کی ضرورت

ہوتی ہے اور بھوک بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مگر اکثر والدین اور بڑوں کی ناسمجھی کی وجہ سے نوجوان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کی بھوک کو جوع البقر سے تعبیر کرتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ لڑکا کیا ہے دیو ہے کہ کھاتا ہی چلا جاتا ہے اس کا جہنم بھرتا ہی نہیں۔ اس قسم کے غیر ہمدردانہ رویے سے نہ صرف وہ جسمانی تسکین سے محروم رہتا ہے بلکہ وہ ایک پریشان کن ذہنی کش مکش میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ جو والدین کے سامنے آتا ہے وہ ہے لباس سے متعلق۔ جوتا خریدتے ہی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ آستینیں مسلسل چھوٹی ہوتی رہتی ہیں۔ کرتے اور پاجامے بہت جلد اونچے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں خصوصاً غریب والدین کو بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ کہاں تک نئے جوتے خریدے جائیں اور نئے کپڑے سلوائے جائیں۔ لہٰذا اس زمانے میں ذرا ڈھیلی ڈھالی چیزیں مہیا کرنی چاہییں۔ جن میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لیے کسی قدر گنجائش موجود ہو۔

قد اور وزن میں غیر معمولی اضافے کے علاوہ اس دور میں شکل و صورت میں بھی خاص تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی ظاہری شباہت بالغوں کی سی ہو جاتی ہے۔ کندھے چوڑے ہو جاتے ہیں، بازوؤں کے پٹھے ابھر آتے ہیں اور جبڑوں کی ہڈیاں خاص طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر جسم بھرا بھرا ہو جاتا ہے۔ اعضائے تناسل سن بلوغ کی جسامت اختیار کر لیتے ہیں۔ آغاز شباب کے وقت ان اعضاء کی نشوونما کی رفتار نمایاں طور پر تیز ہوتی ہے۔

بچپن کی پیاری، میٹھی اور سریلی آواز، بھونڈی اور بھدی ہو جاتی

ہے۔ نوجوان اپنی آواز کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر بے سود۔ یہ بات ان کے لیے تشویش کا سبب بن جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات چیت کرتے ہوئے جھینپتے ہیں۔ اگر انھیں اس وقت ہمدردانہ لہجے میں بتا دیا جائے کہ ان کی آواز خود بخود کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گی تو ان کی بے جا پریشانی دور ہو سکتی ہے۔

نوجوانوں میں ان کی غیر معمولی جسمانی نشو و نما سے جو جذباتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ ان کے لیے مضر ہے۔ بعض نوجوانوں کو ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے اور وہ کچھ جھینپے جھینپے اور کچھ مرجھائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شکل و صورت کی تبدیلی پر ایک بے تکا پن سا محسوس کرتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی کی جماعت ششم میں ایک لڑکا تھا، اس کا قد گرمی کی تعطیلات میں کئی انچ بڑھ گیا، تعطیلات کے بعد جب اس کی جماعت کے تمام لڑکے قد کے لحاظ سے ایک قطار میں کھڑے کیے گئے، تو اسے پہلے نمبر پر کھڑا ہونا پڑا، حالانکہ اس سے پہلے وہ تیسرے نمبر پر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس موقع پر اس کے چہرے سے حجاب اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اپنی گردن نیچی کیے ہوئے تھا اور اپنی پنڈلیوں کو سکوڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ساتھی ہنس رہے تھے، اس سے وہ اور بھی زیادہ خفیف ہو رہا تھا۔

اس منزل پر نوجوان کو جس چیز سے سب سے زیادہ فکر و تشویش محسوس ہوتی ہے وہ ہے اس کے جنسی عمل کی پختگی کا ظہور۔ جب کسی لڑکے کو پہلی بار احتلام کا تجربہ ہوتا ہے تو اس پر ایک ہیجانی

کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر اسے اس نئے جسمانی عمل کی وجہ نہیں معلوم ہوتی یا غلط وجہ معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کی فکر میں گھلنے لگتا ہے۔ اوسط درجے کے لڑکوں میں یہ واقعہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رونما ہوتا رہتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ انھیں اس عمر میں پہلے سے آگاہ کریں کہ اس قسم کا واقعہ ایک فطری عمل ہے، نہ یہ کوئی بُری بات ہے اور نہ اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے سماج میں بدقسمتی سے زیادہ تر نوجوان، اس معاملے میں بالکل بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں اور آسانی سے کسی مکّار عطائی کے جال میں پھنس جاتے ہیں جو اس فطری عمل کو کسی بیماری سے تعبیر کرکے انھیں اور زیادہ ڈرا دیتا ہے اور علاج کے بہانے لوٹتا ہے۔ ہندستانی اخباروں کے اشتہارات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس شرمناک اور دیدہ دلیرانہ لوٹ کھسوٹ کی شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے شہروں اور قصبوں کی دیواریں تک اس قسم کے اشتہاروں سے پاک نہیں ہیں۔ یہ تو ہوا لڑکے سے متعلق۔ اسی طرح اس لڑکی کے حال پر غور کیجیے جسے پہلے سے حیض کے متعلق کوئی معلومات بہم نہیں پہنچائی گئی ہے۔ جب اسے سب سے پہلے اس عمل کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ شدید خوف، ذہنی پریشانی اور ناپسندیدہ جذبات کا شکار بن جاتی ہے۔ بعض اوقات لڑکیاں اس جذباتی اور ذہنی الجھن میں مہینے گزار دیتی ہیں اور ان بیچاریوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ نوجوانوں کو اس قسم کے جسمانی عوامل سے باخبر کرنے کی اشد ضرورت ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس بارے میں

غلط معلومات بہم پہنچانا یا غلط طریقے سے تعلیم دینا اتنا ہی بُرا ہے جتنا کہ اس سے قطعی ناواقف رکھنا۔ جو لوگ نوجوانوں کو اس قسم کی معلومات فراہم کرانا چاہتے ہیں انھیں خود اس موضوع کا سائنٹیفک علم حاصل کرنا چاہیے، نیز انھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس سے نوجوانوں کو روشناس کرنے کا پسندیدہ اور موثر طریقہ کیا ہے۔

جسمانی نشو ونما کی طرح اس منزل میں ذہنی نشو ونما کی وجہ سے بھی بعض مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جب کہ عقل کے پودے میں پھول لگتے ہیں۔ یعنی اس زمانے میں غور وفکر کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے فرد آزادی اور کاوش سے کسی مسئلے پر غور وخوض نہیں کرسکتا تھا۔ اب تک اس کی بیشتر دلچسپیاں ٹھوس اور متعین اشیا ر کھیل کود وغیرہ تک محدود تھیں۔ مگر اب مجرد تصورات بھی اس کی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ اس میں رفتہ رفتہ تعمیم (Generalization) کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یعنی وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ دیے ہوئے واقعات سے نتیجہ نکال سکے، اصول وقواعد وضع کرسکے۔ اس کے ذہنی مشاغل اب زیادہ سنجیدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ وہ اب اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ "میں کیا بنوں گا؟" "میں کیا کروں گا؟" اس دور میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کی صفات پروان چڑھتی ہیں۔ لیکن اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس سے پہلے اس کی تعلیم وتربیت کس نہج پر ہوئی ہے۔ اگر والدین نے اسے محض ایک کھلونا سمجھ کر

پالا پوسا ہے تو اس میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی بمشکل پیدا ہو سکے گی۔ اس کے برعکس اگر والدین نے تعلیم و تربیت میں اس کی انفرادیت کا لحاظ رکھا ہے، تو ان خوبیوں کے پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔

اوسط ذہنی استعداد کا بچہ جس کی عمر سات سال ہو چکی ہے اور وہ اب تک خود اپنے کپڑے نہیں پہن سکتا، اس کی ماں یا بہن اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے، وہ رات کو اکیلا نہیں سو سکتا۔ ایسا بچہ دراصل اپاہج بنایا جا رہا ہے۔ اسے ایک ایسے مرض میں مبتلا کیا جا رہا ہے جو اسے گھر سے کہیں دور جانے سے روکے گا۔ گویا وہ اپنے گھر کے اندر ہمیشہ کے لیے مقید ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے بچے میں بعد ازاں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ وہ ہمیشہ اپنے بڑوں کا دست نگر رہے گا۔

دراصل والدین کے سامنے یہ ایک نازک مرحلہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت میں کیا رویہ اختیار کریں۔ معقول رویہ تو یہ ہوگا کہ نوجوان کو نہ تو اچانک بے نکیل کے اونٹ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے طوطے کی طرح پنجرے میں بند کر کے رکھا جائے ہمارے نوجوانوں میں خود اعتمادی کے فقدان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اور خصوصاً ماؤں کا میلان طبع انھیں اپنے بچوں کو بھی ملکیت سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور انھیں اس خیال سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ ایک دن ان کی اولاد ان کی توجہ اور سرپرستی سے بالکل بے نیاز ہو جائے گی۔

زندگی کی اس منزل پر یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ نوجوان بالآخر

اپنی روزی کمانے کا کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔ مدرسے کا فرض ہے کہ اس معاملے میں اس کی مناسب رہنمائی کرے۔ ہوائی قلعے بنانے سے آخر میں جو مایوسی اور صدمہ ہوتا ہے اس سے جہاں تک ہو سکے نوجوان کو بچانا چاہیے۔ اس سلسلے میں اُسے اور اُس کے والدین کو چند بنیادی باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مختلف پیشوں کے لیے مختلف قسم کی ذہنی صلاحیت اور عملی تیاری درکار ہوتی ہے۔

۲۔ سماجی زندگی کی تنظیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہر قسم کی ذہنی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ نہ تو آبائی پیشے کو زبردستی نوجوانوں کے گلے باندھا جا سکتا ہے اور نہ ہی فقط والدین اور اپنی خواہش کی بنا پر کسی مخصوص پیشے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

حال میں مغربی ملکوں میں ثانوی مدرسے کے طلبہ کی پیشہ ورانہ رہنمائی کے میدان میں بہت بڑی ترقی ہوئی ہے۔ وہاں تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن نوجوانوں نے وہ پیشے اختیار کیے جن کا مشورہ مختلف قسم کی جانچوں کی بنا پر انھیں دیا گیا تھا وہ اپنے پیشے میں ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوئے جو اس قسم کے مشورے سے محروم رہے تھے۔ اس مقصد کی خاطر ثانوی مدرسے میں مختلف قابلیتوں اور رجحانوں کے لحاظ سے طلبہ کے لیے مختلف قسم کے نصابوں کا التزام کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا اس کے والدین کسی ایسے پیشے کے آرزومند ہوتے ہیں جس کے لیے ایک

خاص قسم کی ذہنی استعداد کی ضرورت ہے اور وہ اتفاق سے اس طالب علم میں موجود نہیں ہے تو مدرسہ اُسے اس بات سے آگاہ کردیتا ہے اور کسی دوسرے مناسب پیشے کی سفارش کرتا ہے۔ اور وہ طالب علم نصاب انتخاب کرنے یا پیشہ اختیار کرنے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ جاتا ہے اور اُسے بعد کی ناکامیوں کے تلخ تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے ملک میں بھی ایسی ہی ایک کوشش کثیر المقاصد مدارس (Multipurpose Schools) کے تحت شروع کی گئی تھی۔ مگر ابھی ہمارے ہاں ایسے بہت کم ادارے ہیں اور جو ہیں بھی وہ بوجوہ مقبولیت حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ اس صورت حال میں دولت مند اور نامور باپ کا کند ذہن اور ناکارہ بیٹا تعلیم اور پیشے کے معاملے میں ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ باپ کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ بیٹا دھن، دولت اور شہرت کے لحاظ سے اس سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر مرتبہ حاصل نہیں کرلیتا۔ اس لیے وہ اپنے بیٹے کو اپنی سماجی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھے تعلیمی ادارے میں داخل کراتا ہے اور اس کے نزدیک اچھا ادارہ وہی ہے جہاں اخراجات زیادہ ہوں اور جہاں صرف ان ہی لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرسکیں، جو اپنی سماجی حیثیت کے اعتبار سے کم از کم اس کے ہم پلہ ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد پر ولایتی سند کا ٹھپہ لگوانے کے لیے ہزاروں روپے ضائع کردیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دیس میں اس لڑکے کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہے جو کسی گم نام اور نادار باپ کا بیٹا ہے، لیکن جسے

قدرت نے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ اس بے چارے کو ترقی کرنے کے خاطر خواہ مواقع میسر نہیں ہوتے۔ اور یہ کلی بغیر کھلے مرجھا جاتی ہے۔ غور سے دیکھیے تو نہ صرف یہ اس کا ذاتی نقصان ہے بلکہ یہ ایک قومی خسارہ بھی ہے۔ اس کی خداداد صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں، تو قوم بھی اس کی ذات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس قومی خسارے کو روکنے کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومت ہند نے ایسے ہونہار طلبہ کی تعلیم کے لیے معقول امداد کی فراہمی کا اعلان کیا ہے۔ مدرسے کا فرض ہے کہ طلبہ کی صلاحیتیں اور کوتاہیاں مناسب طریقے سے معلوم کرے اور والدین کو برابر باخبر رکھے، تاکہ وہ اپنی اولاد سے دور از کار امیدیں وابستہ کرنے سے باز رہیں۔ اور وہ خود اور ان کی اولاد دونوں اس مایوسی اور خفت سے بچ سکیں جو قابل حصول مقاصد میں ناکامی کی صورت میں ہوتی ہے۔

عام طور پر ایک ناتجربہ کار نوجوان پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہونے کے لیے کوئی دروازہ ڈھونڈتا ہے۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اچھی آسامیاں پہلے سے پُر ہیں یا اس کی دسترس سے باہر ہیں اور اُس کی کہیں بھی کھپت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی بھی کام نہیں ملے گا اور وہ مایوسی اور خوف و ہراس کے عالم میں دن کاٹتا ہے۔ اور اس صورت حال میں جو کام بھی سب سے پہلے اس کے ہاتھ آجاتا ہے اسے بطور پیشہ اختیار کر لیتا ہے، چاہے اس کے لیے اس کی طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کو ان آسامیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں، جن کی ملک میں زیادہ مانگ ہے۔

ہر آزاد ملک میں جہاں کی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہے، اس قسم کے اعداد و شمار سرکاری طور پر باقاعدہ شائع کیے جاتے ہیں. مگر ہمارے ملک میں اس وقت اس کی بڑی کمی ہے. یہاں صرف چند ہی بڑے شہروں میں اس قسم کا انتظام ہے جہاں (Employment Exchange) کے دفاتر کے ذریعے ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں. پھر بھی اس وحشت کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے جو خالی جگہوں کی کمی کے خیال سے نوجوانوں پر طاری رہتی ہے۔ اس بارے میں طلبہ کے زاویۂ نگاہ کو بدلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ انھیں یہ سمجھانا پڑے گا کہ ان آسامیوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں جن پر تجربہ کار لوگ فائز ہیں بلکہ ان آسامیوں کے متعلق سوچیں جو کہ اُن جیسے ناتجربہ کار لوگوں کے لیے خالی ہیں. اس طرح ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے اور ان کی پریشانی بڑی حد تک دور ہو جائے گی.

عنفوانِ شباب کی منزل میں بعض اہم سماجی اور اخلاقی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں. اس کی ایک وجہ جنسی قوت کا ظہور ہے. ہر ایک مہذب جماعت میں جنسی جبلّت کو عموماً ایک شیطانی اور ناپاک قوت سمجھا جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ سبھی اس فطری رجحان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ اکثر پسندیدہ نہیں ہوتا۔ نوجوان کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ اگر اُسے کسی کام سے زبردستی منع کیا جائے تو وہ بغاوت کرتا ہے. اور اس کام کو کھلم کھلا یا چھپے چوری کرنے میں اُسے فتح و کامرانی کا احساس ہوتا

ہے۔ جس عشق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوں وہ اس کے لیے زیادہ تسکین اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ متوازن نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو جنس مخالف کے ہم عمر افراد سے ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ اس معاملے میں والدین اور بڑے بوڑھوں کا رویہ ہمدردانہ اور دانش مندانہ ہونا چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں جب نوجوان لڑکے لڑکیاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، تو اکثر بڑے بوڑھے ان کے میل ملاپ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور بہت جلد وہ خاندانوں کی ناک کٹنے والی ہے۔ لیکن یہ رویہ مناسب نہیں ہے۔ والدین کو اس معاملے میں نہ تو اتنی بے نیازی برتنی چاہیے کہ ان کے لڑکے لڑکیاں جو چاہیں کریں اور نہ ہی انھیں اس قدر شکی ہونا چاہیے کہ ہر وقت ان کی نگرانی مجرموں کی طرح کرتے رہیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ایک بھی طریقہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جنسی معاملات میں بھی والدین کو اسی قسم کی دلچسپی ہونی چاہیے، جیسی کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت، اس کے مستقبل اور دوسرے مسائل میں رکھتے ہیں۔ علم نفسیات کے نزدیک مخالف جنسوں کے افراد کی باہمی دلچسپی اور محبت کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ وہ مسائل زیادہ مشکل ہیں جن کا تعلق غیر فطری جنسی مظاہر سے ہے۔ مثلاً امرد پرستی، جلق وغیرہ۔ اور بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس قسم کے شواہد اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے تعلیمی نقطۂ نظر سے یقینی یہ دانش مندانہ اقدام ہوگا کہ نوجوانوں کو جنسیات سے متعلق ضروری

معلومات بہم پہنچائی جائے۔ مثلاً علم اعضا کے سلسلے میں انھیں افزائش نسل کے عمل اور ضبط نفس کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے کہ یہ جسمانی صحت، نفسیاتی توازن اور اقتصادی خوش حالی کا ضامن ہے۔ یہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو امید ہے کہ اوسط درجے کے ذہین نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ضبط نفس کی ترغیب ہوگی۔ قانونی شادی کے علاوہ اور کسی دوسری قسم کے جنسی تعلقات سے جن امراض خبیثہ میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے، ان سے بھی نوجوانوں کو باخبر کر دینا چاہیے۔

ضبط نفس کے حاصل کرنے کی بعض تدابیر بہت مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ کسی محرک کے زور کو ختم کرنے کا نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ توجہ کو دوسری دلچسپیوں کی طرف موڑ دیا جائے۔ ثانوی مدرسے میں ورزش اور کھیل کا اہتمام اس مقصد کے حصول میں معاونت کرتا ہے۔ اس قسم کے مشاغل نہ صرف جسمانی نشوونما کے لیے مفید ہیں بلکہ ان کی بدولت نوجوان کو جنسی باتوں پر سوچنے اور جسمانی لذتوں کو حاصل کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ مشہور ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ کوئی پسندیدہ مصروفیت نہ ہو تو کسی گھٹیا کام میں پھنسنے کا بہت امکان ہوتا ہے۔

عنفوانِ شباب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس منزل میں فرد خیر و شر کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس رجحان کو مذہب و اخلاقیات میں دلچسپی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ سماجی اثرات کا نتیجہ ہے۔ چونکہ

نوجوان میں خود فکری کی صلاحیت رونما ہوتی ہے اس لیے وہ ان بنیادی تصورات کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے جو سماج میں عقیدے کے طور پر جاری و ساری ہوتے ہیں۔ نوجوان پر دو بے پناہ قوتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو بظاہر متضاد ہیں۔ ایک قوت تو اُسے اپنی روح میں پوشیدہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری قدرت میں۔ اسے اپنی روحانی قوت پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ خود کو ہر چیز کا اہل سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب اسے قدرت کی بے پایاں قوت کا ادراک ہوتا ہے، تو اسے اپنی بے چارگی اور کم مایگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہی مذہبی شعور کی بنیاد ہے۔ کبھی کبھی نوجوانوں کا مذہبی جذبہ دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ اسی محرک کی وجہ سے بہت متفکر اور گم سم سے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ وہ گھنٹوں مذہبی کتابوں کے مطالعے میں غرق رہتے ہیں۔ بعض وقت وہ تنہائی میں آنسو بہا کر دل کو ہلکا کرتے ہیں اور کبھی خود کو جسمانی اذیتیں پہنچا کر تزکیۂ نفس کی سبیل نکالتے ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں کو تنہائی میں خالی وقت گزارنے کا کم سے کم موقع دینا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں کسی عملی کام میں مصروف رکھنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔

بچپن کے زمانے میں بچہ سماجی قوانین کی پابندی بلا سمجھے بوجھے کیا کرتا ہے۔ مگر نوجوانی میں سماجی شعور اجاگر ہوتا ہے اور وہ سمجھ بوجھ کر سماج کی معین کی ہوئی کسوٹی پر اپنی ذات کو پرکھنے اور پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں قربانی اور

ایثار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے وہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا جماعت اور مدرسے کے نظم و نسق میں نوجوانوں کو شرکت کرنے اور سماجی خدمات انجام دینے کے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔ اسکاؤٹنگ اور دیگر اجتماعی منصوبے بھی اس نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوں گے۔

نوجوان اپنے کردار کا محاسبہ خود کرتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ کہیں اس کے قول و فعل میں کوئی چیز قابلِ اعتراض تو نہیں ہے۔ اسے اپنی شخصیت کے ہر پہلو کی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی شکل و صورت کے بناؤ سنوار میں گھنٹے صرف کر دیتا ہے۔ آئینے میں اپنے چہرے کو اکثر دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے بازوؤں اور پانو کو جھکاتا، موڑتا رہتا ہے۔ اس بات کو بہت محسوس کرتا ہے کہ لوگ اسے کس طرح مخاطب کرتے ہیں، کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے متعلق مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرتا رہتا ہے۔ اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ اس کی ان باتوں کو ہمدردی کے ساتھ دیکھیں اور رکھیں۔

اس دور میں فرد اپنی شخصیت کا کم و بیش ایک صاف نقشا بنا لیتا ہے۔ وہ ان خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نصب العین کے حصول کے لیے لازمی ہیں۔ اس لیے نوجوان کے سامنے خاص طور پر اچھے کردار کے نمونے پیش کرنے چاہییں، مثلاً عظیم تاریخی شخصیتیں، زمانۂ حال کے بڑے آدمی اور گرد و نواح کے مقبول اشخاص وغیرہ۔ مگر یہاں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ

ہیں نوجوان کسی عظیم شخصیت کو بت بنا کر پوجنے نہ لگے۔ بلکہ رفتہ رفتہ
اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اخلاقی اصولوں کی روشنی میں
دوسروں کو اور اپنی ذات کو پرکھ سکے اور اپنی اصلاح خود
کر سکے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات کسی شخص واحد کا
چربہ نہ ہو، بلکہ اس کی شخصیت مختلف اشخاص کی خوبیوں سے عبارت
ہو، مثلاً وہ اپنی شخصیت کی تعمیر میں کسی شخص کی ہمت و جواں مردی،
کسی کی دیانت داری، خلوص اور نیک نیتی اور کسی کی حُبِ وطن یا
انسان دوستی کو نمونہ سمجھ کر اپنائے۔ مدرسہ سیرت سازی کے
عمل میں ڈرامے سے بھی مدد لے سکتا ہے نوجوان اداکار جب
اسٹیج پر آتا ہے تو وہ اپنے رول کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے۔
اس سلسلے میں یہ بات بہرکیف سامنے رکھنی چاہیے کہ اس لڑکے
یا لڑکی کو کسی بدمعاش (Villain) کا پارٹ بھول کر
بھی نہ دیا جائے جو بُری باتوں کی طرف مائل نظر آتا ہو۔ اسی طرح
اچھی فلموں سے بھی شخصیت کی تعمیر میں مدد لی جا سکتی ہے۔ مگر
یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ مؤثر
فرد کا اپنا قریبی ماحول ہے جس میں وہ رات دن رہتا سہتا ہے۔
اس کے والدین، خاندان کے لوگ اور اساتذہ، اس کے ساتھی
اور دوست، نیز گرد و نواح کے اشخاص یہ سبھی اس کی شخصیت پر
اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے ماحول کو اچھے سے اچھا بنانے کی
کوشش کرنی چاہیے۔

نوجوان کی تلوّن مزاجی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اور اسی بنا

پر اسے اکثر بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ در اصل کلیتہً موردِ الزام نہیں ہے۔ اس میں ہماری تہذیب کا بھی ہاتھ ہے۔ بعض جبلتیں اور میلانات جو اس عمر میں بڑی شدو مد سے اُبھرتے ہیں، انھیں تہذیب معیوب قرار دیتی ہے۔ نوجوان جسمانی اعتبار سے ایسے بہت سے کام کرنے کا اہل ہو جاتا ہے جن کے لیے موجودہ سماج مواقع فراہم نہیں کرتا، اس لیے اُسے بہت عرصے تک بچے کی سی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

بالغ بھی شاید موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہے، لیکن وہ اپنی سمجھ بوجھ کی بدولت کسی نہ کسی طرح حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ نوجوان کے بس کی بات نہیں ہے وہ بے چارہ اپنے حالات پر قابو نہیں پا سکتا۔ اور جب اُسے ناکامی ہوتی ہے، تو وہ ایک ہیبت ناک جذباتی کش مکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس لیے نوجوان کو یہ احساس دلانا مفید ہوگا کہ انسان کی ہر ایک آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اُسے صرف ان خواہشات پر اکتفا کرنا چاہیے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔

نوجوان کو ذہنی اور جذباتی کشمکش سے جو تکلیف ہوتی ہے، اس کے احساس کی شدّت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ میں ہی ایک بدنصیب ہوں جسے اس پریشان کن تجربے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا اسے اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ یہ مسائل عالم گیر ہیں، اور کم و بیش

سبھی نوجوانوں کو ان سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور سبھی اسی طرح تکلیف اُٹھاتے ہیں۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لیے وسیع تخیل اور گہری ہمدردی درکار ہے۔ نوجوان کو اس طرح مسلح کرنا چاہیے کہ وہ خود اپنی جنگ کامیابی سے لڑ سکے اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ تعلیم و تربیت کا یہی فریضہ ہے۔

تعلیم کے بعض اہم پہلو

۵- تعلیم اور امن و جنگ

"میں ہٹلر کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔ میں ہٹلر کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔" بچہ بے ہوشی کی حالت میں بار بار بک رہا تھا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ اس کے ماں باپ اس کو اپنی گود میں لٹائے پھوٹ پھوٹ کر۔۔۔رو رہے تھے۔ ان کا یہ جگر گوشہ مدرسے کے اور بچوں کے ساتھ کوئی سو، سوا سو میل کا رات دن پیدل سفر کر کے آیا تھا۔ اور کیسا سفر؟ جس میں قدم قدم پر خطرے اور مصیبتیں تھیں۔ پہاڑیاں، جھاڑیاں، ندی اور نالے تھے اور اوپر سے برف باری ہو رہی تھی۔ اس سفر میں کئی بچوں کے ہاتھ پاؤں زخمی ہوئے اور بہتیروں کو نمونیا نے آ دبوچا۔

"میں ہٹلر کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔" رٹتے رٹتے بچے کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ ہاں، اس نے اپنی جان دے دی۔ شاید ہٹلر کے لیے تو نہیں مگر ہٹلر کی وجہ سے ضرور۔ اور اس تعلیم کی وجہ سے جو اسے ہٹلر کے مدرسوں اور فاشسٹ سماج میں ہر آن دی جاتی تھی۔ یہ ایک بچے کی موت نہیں بلکہ اُن لاکھوں

کروڑوں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کی موت ہے جو پچھلی عالم گیر جنگ میں ہٹلر کی اس تعلیم کا شکار ہوئے۔

آج بھی دنیا میں موت اور زندگی کی کش مکش بدستور جاری ہے۔ ایک راستے پر ٹینکوں، جنگی طیاروں اور آبدوز کشتیوں کے انبار لگے ہیں۔ ہمباروں کی گڑگڑاہٹ اور توپوں کی نقل و حمل کے شور و شر میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ موت انسان کا خیر مقدم کرنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ ایک راستہ تو یہ ہے اور دوسرا راستہ وہ ہے جو مرغزاروں، کھیتوں اور کارخانوں کی طرف جاتا ہے۔ جہاں ٹریکٹروں، کپڑے بننے کی مشینوں اور پن بجلی کے اسٹیشنوں کی ہماہمی ہے۔ جہاں انسان کی پُرامن تخلیق کا نغمہ فضا میں گونج رہا ہے۔ اور زندگی کی گہما گہمی اور رعنائی انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

دنیا کے بسنے والے ان دو راستوں میں سے کس راستے کو اپنائیں گے؟ بظاہر یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔ ہم سب امن چاہتے ہیں، ہم اپنے بچوں کی ہنسی، کھیتوں کی ہریالی، اور بستیوں کی چہل پہل کو جنگ کی دوزخ کے حوالے نہیں کریں گے۔ ہم اپنے شہروں کو ناگاساکی اور ہیروشیما کی طرح ایٹم بم کی نذر نہ ہونے دیں گے۔ لیکن جنگ اور امن کا سوال اتنا آسان نہیں ہے۔ اس سوال کو پیچیدہ بنانے میں آج دنیا کی بڑی بڑی سامراجی طاقتیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی جنگی سازشوں کو اخلاقی اصولوں کا لبادہ پہنا کر پیش کرتی ہیں۔ کبھی یہ طاقتیں "نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی" جیسے

جنگی معاہدے کے جواز کے لیے جمہوریت اور عیسائی تہذیب و تمدن کی حفاظت کا نعرہ بلند کرتی ہیں تو کبھی جاپانی "پیس ٹریٹی" جیسی شاطرانہ چال کو بین الاقوامی مساوات کے اعلان کے پیچھے چھپاتی ہیں۔ ایسی صورت میں عام آدمی کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جنگ اور امن کے مسئلے میں واضح طور پر اپنا رُخ متعین کر سکے۔

مگر امن عالم کے لیے شاید سامراجیوں کے جنگی معاہدے اور سازشیں بھی اتنی خطرناک نہیں ہیں جتنی کہ اُن کی وہ تعلیمی اور تہذیبی پالیسی جس کے ذریعے وہ اپنے ملک اور دوسرے ملک کے بچوں اور نوجوانوں کو جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر جنگ کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ ان کی اس امن دشمن چال کا اندازہ ان تعلیمی سرگرمیوں سے لگایا جا سکتا ہے جو آج امریکا میں بڑے پیمانے پر اسکولوں اور کالجوں میں نظر آ رہی ہیں۔

بہت عرصہ نہیں ہوا، جب امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں ایٹم بم اور دوسرے تباہی نازل کرنے والے آلاتِ جنگ سے بچنے کی تدابیر کو تعلیمی پروگرام کا ایک اہم جزو بنایا جا رہا تھا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ اُن اسکولوں کے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا ہوگی جہاں اُنھیں روزانہ ایٹم بم کا ہوّا دکھایا جاتا ہو۔ جہاں آئے دن اُنھیں "دفاعی تدابیر" کے ڈرامے میں حصّہ لینا پڑتا ہو۔ وہ ایک موہوم خطرے سے کس قدر سہمے رہتے ہوں گے۔ پھر کیا عجب ہے کہ اُس زمانے میں امریکی بچوں میں ایک خاص قسم کے بیماروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ان دِنوں

ذہنی بیماریوں کے ماہروں کے سامنے بہت سے ایسے کم عمر بچوں کے معاملے لائے گئے، جو سوتے سوتے چونک اُٹھتے اور چیخنے لگتے ــــــ "اآں، اآں، ایٹم بم! ہائے مرگیا! سرخ روسی!" اس دہشت انگیز فضا میں نہ جانے کتنے نونہالوں کی زندگی اجیرن ہوگئی!

اس کے علاوہ نئی پود کو زہر آلود کرنے کی ہر طرح کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوگی کہ ایک طرف تو امریکا کے ماہرینِ تعلیم یونائیٹڈ نیشنز اور یونیسکو کے مقاصد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کے دل میں دوسرے دیسوں کے لیے عزت پیدا کرنا' مدرسے کا ایک اہم فرض ہے اور دوسری طرف عملاً مدرسوں میں دوسرے دیسوں کے خلاف نفرت کا بیج بویا جاتا ہے۔ سوویت یونین سے سمجھوتا ہوجانے کے باوجود آج بھی امریکی اسکولوں میں درسی کتابوں اور سبقوں کے ذریعے سوویت یونین اور اُس کے ساتھی جمہوری ملکوں کے خلاف منافرت پھیلانے کی مہم جاری ہے اور ہٹلر کے اُس منحوس قول کو پھر دہرایا جا رہا ہے کہ "بقائے انسانی کے لیے جنگ ضروری چیز ہے۔"

اس کے علاوہ نئی نسل کو امریکا کی ان شاندار لبرل روایات سے محروم رکھنے کی ہر طرح کوشش کی جا رہی ہے جو انسان دوستی اور ترقی پسندی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مارک ٹوین جیسے مصنفوں کو کہ جنھوں نے اپنی تخلیقات سے امریکی زندگی کے حسن کو نکھارا ہے، چند سال پہلے اسکولوں اور پبلک لائبریریوں سے دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔ اور ایسے لٹریچر کو ممنوع قرار دیا

گیا تھا جس پر امن کی حمایت اور جنگ کی مخالفت کرنے کا شبہ تھا۔ چنانچہ "نیشن" (Nation) جیسے لبرل ہفتہ وار کی نیویارک کے اسکول اور پبلک کتب خانوں میں ممانعت ہوگئی تھی۔

امریکا کے مدرسوں میں لازمی فوجی تربیت کا پروگرام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شروع شروع میں اس پروگرام پر امریکا کے تعلیمی حلقوں میں بہت بحث رہی۔ اور معلمین کے ایک باوقار گروپ نے اس بنیاد پر بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت کی کہ اس پروگرام سے ان لبرل روایات کی جڑ کٹ جائے گی جو امریکا کے تعلیمی میدان میں صدیوں سے چلی آرہی ہیں، اور جن کے ساتھ جیفرسن جیسے آزادی اور ترقی کے علمبرداروں کے نام وابستہ ہیں۔ لیکن بالآخر جنگی ہسٹیریا نے علم ودانش پر فتح پائی اور ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے پر تمام نوجوانوں کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دی گئی۔ اگر حالات اسی قدر خراب ہوتے گئے تو ڈر ہے کہ کہیں اسکول ماسٹر کی جگہ فوجی سارجنٹ نہ لے لے اور امریکی اسکول نازی اسکولوں کی طرح فوجی کیمپ نہ بن جائیں۔

امریکی حکومت کی جنگی پالیسی کا اعلیٰ تعلیمی اداروں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ آج وہاں سائنس کے میدان میں جو "ریسرچ" ہو رہی ہے اس میں زیادہ توجہ اس بات پر دی جا رہی ہے کہ انسانی نسل کو تباہ کرنے کے آلات اور وسائل کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مؤثر بنایا جائے۔ اس کام کے لیے بہت سی یونیورسٹیوں میں حکومت اور سرمایہ داروں کی فاؤنڈیشنوں کی طرف سے اربوں ڈالر

رقم وقف کی گئی ہے۔ سائنس کہ جس کا منصب انسانی زندگی کو سنوارنا ہے، تباہیوں اور بیماریوں پر قابو پانا ہے، کھانے پینے اور رہنے سہنے کی سہولتیں مہیا کرنا ہے، تہذیبی زندگی کو چار چاند لگانا ہے، آج وہی انسان کی تباہی کے کام میں لائی جا رہی ہے۔ آج سائنس کی سیاست سے بے تعلقی کے نعرے کی حقیقت کھل گئی ہے۔ اب سائنس داں بیماریوں کے جراثیم کو مارنے کی تدابیر نکالنے کے بجائے ایسے مہلک جراثیم معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جنھیں انسانی آبادیوں پر دم گھوٹنے والی گیس کی طرح استعمال کیا جا سکے۔ وہ ریگستانوں کو گلستان بنانے کے بجائے بستیوں کو ویران کرنے کے لیے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نہ جانے کیا کیا تیار کرتے ہیں۔ سائنس کی اس سے زیادہ عصمت دری کیا ہو سکتی ہے!

امریکا میں تعلیم کو جنگی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تعلیمی اداروں کے انتظامات میں فوجی افسروں کا عمل دخل دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آج کئی مشہور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے صدر بڑے بڑے فوجی افسر ہیں۔ جنرل آئزن ہاور جو پچھلی بڑی لڑائیوں میں اتحادیوں کے چیف آف اسٹاف تھے اور پھر مغربی یورپ کے ڈیفنس پروگرام کے کرتا دھرتا رہے، کولمبیا یونیورسٹی پر صدر کی حیثیت سے کئی سال تک قابض رہے۔ اور فوج کے سکریٹری گرے نارتھ کیرولائنا یونیورسٹی کے صدر تھے۔ اسی طرح جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے ڈین، لیوس کالج کے چانسلر، کیلی فورنیا یونیورسٹی کے صدر اور دوسرے

متعدد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے عہدے دار مشہور فوجی افسر رہ چکے ہیں۔ بعض بعض یونیورسٹیوں میں تو باقاعدہ فوجی شعبے قائم کر دیے گئے ہیں جن میں پروفیسروں کی تعداد دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ ایک زمانے میں کینٹیک یونیورسٹی کے فوجی سائنس کے شعبے میں ۱۳ پروفیسر تھے جبکہ شعبۂ اقتصادیات میں پروفیسروں کی تعداد صرف ۵ تھی۔ آج بھی بہت سے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے سربراہ ایسے لوگ ہیں جو پہلے امریکا کی فوج میں اعلیٰ مدارج پر فائز رہ چکے ہیں۔ وال اسٹریٹ کی طرح پینٹاگن سکوائر کا جال ابتدائی مدارس سے کالج تک پھیلا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ امریکا میں جگہ جگہ شور مچا کر تعلیمی اداروں میں ناپسندیدہ اور خطرناک عناصر گھس گئے ہیں۔ چنانچہ اسکولوں اور کالجوں کو ایسے عناصر سے پاک کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ لبرل استادوں کو اُن کے "خطرناک خیالات" کی خاطر طرح طرح سے ستایا گیا۔ اور بعض کو ان کی خدمات سے سبکدوش بھی کر دیا گیا۔ اس بدحواسی کی فضا میں بعض بہت ہی شرمناک سانحے واقع ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جب نیویارک میں امریکا کے دانشوروں کی طرف سے امن عالم کے لیے تہذیبی کانفرنس ہوئی تو وہاں کے مشہور معلم سڈنی ہک نے کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو لنچ (lynch) کرنے (خلاف قانون سزائے موت دینے) کی دھمکی دی۔ اس کانفرنس میں امریکا کے بہت سے اہل علم اور دانش ور شامل تھے۔ اسی طرح ۱۹۵۰ء میں امریکا میں ایک نہایت ہی دلدوز اور عبرت ناک واقعہ پیش آیا۔ امریکہ کے مشہور

ادیب اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر میتھیسن نے خودکشی کرلی۔ یہ معلم "American Renaissance" کا مصنف امریکی ادب میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے مشرقی جمہوریتوں کا دورہ کرنے کے بعد ایک نہایت ہی بصیرت آموز کتاب "From the Heart of Europe" لکھی تھی مگر امریکا کی موجودہ ہسٹریائی فضا میں اس قسم کی تخلیق کی گنجائش نہ تھی۔ اس کتاب پر اس قدر لے دے کی گئی اور اس پر اتنی کیچڑ اچھالی گئی کہ میتھیسن اسے جھیل نہ سکا اور تنگ آکر اس نے بالآخر خودکشی کرلی۔

میتھیسن کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اسے امریکا کی شاندار جمہوری روایات کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھنا چاہیے۔ وہ روایات جن سے دنیا کی تمام غلام قوموں نے روشنی اور ہدایت حاصل کی ہے انھیں آج امریکا کا حکمراں طبقہ ختم کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ موت ایک احتجاج ہے اور نفرت کا اظہار ہے ان چیزوں کے خلاف جو امریکا میں ہورہی ہیں۔ یہ موت ایک تیکھا طنز ہے اس سماجی نظام پر جو لوگوں کے خلوص اور نیک نیتی پر حملہ کرتا ہے اور اُن کے ضمیر کو چوٹ پہنچاتا ہے۔

اگر ایک طرف جنگ کا ماحول تعلیم و تمدن کے سرچشموں کو اس طرح خشک کررہا ہے تو دوسری طرف امن کی کوششیں تعلیم گاہوں کو آب حیات عطا کررہی ہیں۔ سوشلسٹ ممالک میں انسانی زندگی کو مالا مال اور حسین بنانے کے لیے جو جدوجہد ہورہی ہے اُس کا اندازہ عقل کو دنگ کردینے والے ان منصوبوں سے لگایا جاسکتا ہے

جن پر یہ ملک اس وقت کار بند ہیں۔

ذرا غور کیجیے کہ سوویت یونین میں جنوبی یوکرائن اور شمالی کریمیا کا ہزاروں میل کا خطّہ جو اب تک قدرت کی ستم ظریفی سے ریگستانی ہواؤں کی تفریح گاہ بنا ہوا تھا، ایک شاداب اور سرسبز علاقے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس غرض سے اس خطّے کے تمام بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے ہزاروں میل لمبے جنگلات کے حفاظتی منطقے بنائے گئے جو ریگستان سے آنے والی گرم اور خشک ہواؤں اور ریتیلے طوفانوں کے خلاف ڈھال کا کام کریں گے اور یہ خطّہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور ہرے بھرے باغیچوں کو اپنے دامن میں لیئے ہوئے ایک خوش حال اور بھری پُری زندگی کا ضامن ہوگا۔

اسی طرح دریائے والگا، نیپر اور آمو دریا کی وادیوں میں پن بجلی اور آب پاشی کے عظیم منصوبوں نے یوکرائن، کریمیا اور وسط ایشیا کے بہت بڑے علاقے کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ ترکمانستان اور قراکم ریگستان کے بسنے والے صدیوں سے خواب دیکھتے چلے آئے تھے کہ اُن کی سرزمین وطن کے ہونٹ بھی کبھی تر ہوں گے۔ اُن کا صحرا بھی کبھی چمن بنے گا، بلبل چہکیں گے اور خوشی کے شادیانے بجیں گے۔ آج ان کے اس خواب کی تعبیر ابھرتی دکھائی دے رہی ہے۔ اور یہ سب کرشمہ پُرامن محنت کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا سوویت یونین میں انسان کے تخلیقی سرچشمے جبر اور پابندی کی تمام رکاوٹوں کو توڑ کر بے تحاشا ابل پڑے ہیں اور اب سوویت شہریوں کی آزاد محنت انہونی کو ہونی بنا رہی ہے۔ قدرت کا چولا بدل رہی ہے۔

کہیں یہ محنت دریاؤں کا رُخ موڑ رہی ہے تو کہیں بانجھ زمین کو بار آور بنا رہی ہے۔ بہت سے علاقوں کا طبعی جغرافیہ اتنا بدل گیا ہے کہ اُسے بمشکل پہچانا جا سکتا ہے۔ ایسی عظیم الشان تبدیلیاں اتنی تیزی کے ساتھ آج تک کسی اور دیس میں نہیں ہوئی ہیں۔

یہ امن کی برکت ہے۔ جس سے سویت یونین کے بسنے والے سرشار ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امن کا تیز دھارا جنگ کے خس وخاشاک کو بہا لے جائے گا اور دنیا زندگی کا گیت گائے گی نہ کہ موت کا نوحہ کرے گی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اتنے جوش اور ولولے کے ساتھ ان حیرت انگیز تعمیری کاموں میں اپنی تخلیقی قوتوں کو کھپا رہے ہیں۔ ان کی جدوجہد امن عالم کی بنیادوں کو مضبوط بنا رہی ہے۔

سویت یونین کی امن پسند پالیسی کا پرتو وہاں کے تعلیمی اداروں میں نظر آرہا ہے۔ تمام تعلیمی فضا تعمیری کام کے نغموں سے سرشار ہے۔ سویت بچّوں اور نوجوانوں کے نزدیک کام سب سے بڑا ذریعۂ عزّت ہے، مقدس فریضہ ہے، شان و شجاعت کا مظہر ہے اور اسی لیے وہ سب تمام تعمیری کاموں میں مصروف ہیں۔

سویت یونین کے مدرسوں میں پڑھنے لکھنے کے لیے جو مواد مہیا کیا جاتا ہے، وہ دوسرے ملکوں کے خلاف جارحانہ جذبات بھڑکانے کے بجائے دنیا میں پُر امن فضا پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اس کا ایک اور دلچسپ اور مؤثر پہلو ہے۔ سویت یونین میں ہر سال بچّوں کا "کتابوں کا ہفتہ" ہوتا ہے۔

اس ہفتے کے دوران مدرسوں اور کتب خانوں میں بچوں کی کانفرنسیں ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنی پسند کی کتابوں، نظموں، کرداروں وغیرہ سے متعلق بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور مصنفوں سے ملتے ہیں۔ اس قسم کی کانفرنسوں میں امن کے لٹریچر کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اسی طرح دوسرے سوشلسٹ ملکوں کے تعلیمی پروگرام میں امن پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ کئی سال ہوئے وارسا میں عالمی امن کانفرنس کے موقع پر پولینڈ کے بچوں نے اپنے مدرسوں میں جو کام کیا تھا، اس کا نمونہ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کے بچے امن کے معاملے میں کس درجہ عملی دلچسپی لے رہے ہیں۔ تمام سوشلسٹ ملکوں میں بچّہ امن تعمیری کاموں میں کس قدر ہاتھ بٹا رہا ہے اور وہاں کے تعلیمی ادارے امن قائم کرنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو ان ملکوں سے واپس آنے والے مختلف ہندوستانی تہذیبی وفدوں نے وقتاً فوقتاً دیے ہیں۔

لیکن ان ملکوں کی مساعی امن کے باوجود دنیا جنگ کے خطرے سے محفوظ نہیں ہے اور اس کا اثر نہ صرف جنگ باز ممالک کے تعلیمی نظام پر پڑ رہا ہے بلکہ اس سے دنیا کے تمام ملکوں کے تعلیمی پروگرام پر ضرب آتی ہے۔ اس وقت ہر ملک کے ذرائع اور وسائل کا بہت بڑا حصہ جنگ کی تیاری یا دفاعی تدابیر پر خرچ ہو رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم جیسے تعمیری کام کے لیے

کافی رقم صرف نہیں کی جا سکتی۔ پچھلی عالمی جنگ میں جو ملک میدانِ کارزار بنے تھے، ان میں تعلیمی اداروں کی جو گت بنی تھی اُسے اب تک پورے طور پر درست نہیں کیا جا سکا ہے۔ نہ جانے کتنے اسکول اور کالج بموں کی زد میں آئے، کتنی لائبریریاں اور سائنس کی تجربہ گاہیں جل کر بھسم ہوگئیں، کتنے میوزیم کھنڈر بن گئے اور نہ جانے کتنے اساتذہ اور طلبہ جنگی دیو کے منہ میں جا پہنچے۔ ان سب کا دوبارہ فراہم کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے کثیر وسائل اور لمبی مدّت درکار ہے۔ اور سب سے زیادہ ضرورت ہے امن کی تاکہ تعلیم جیسے تعمیری کام پر خاطر خواہ توجہ دی جا سکے۔

آج بھی جنگ کی خونیں گھٹائیں اُفقِ عالم سے کلیتاً ہٹی نہیں ہیں۔ اس سے ہر شخص سہما ہوا ہے کہ نہ جانے وہ کب برس پڑیں اور ساری انسانیت کو اپنے سیلاب میں بہا لے جائیں۔ اس صورتِ حال میں تعلیمی کام کرنے والوں کی کیا ذمّے داری ہے؟

بعض کوتاہ اندیشوں کے نزدیک ایک استاد کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ "واقعات" اور "حقائق" کو اُن کے اصلی رنگ روپ میں پیش کر دے اور کسی چیز کے بارے میں اپنی ذاتی رائے سے پرہیز کرے کہ طالب علموں کے فیصلے کو متاثر کرنا امانت میں خیانت ہے اور معلمی کے پیشے کی توہین ہے۔ اس اصول کے مطابق استاد کو متنازع فیہ مسئلوں سے گریز کرنا چاہیے۔ غالباً ان نام نہاد "واقعات اور حقائق" کے شیدائیوں کو معلوم نہیں کہ واقعات اور حقائق کے اظہار کے لیے بھی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نازی جرمنی

کے کتنے استادوں میں اُس آرٹ ٹیچر کی سی جرأت تھی کہ جس نے ایک فوجی سارجنٹ کو کلاس میں داخل ہونے پر ڈانٹ دیا تھا کہ "نکل جاؤ میرے کلاس سے۔ تمھاری داخلت سے میرا ڈزائن خراب ہو جائے گا۔" اُسے اپنے ڈزائن اور لکیروں کی سچائی کو برقرار رکھنے کے لیے جو کچھ جھیلنا پڑا اُس سے نام نہاد "واقعہ پرست" اساتذہ کو سبق لینا چاہیے کہ واقعات کو ہو بہو پیش کرنے کے لیے بھی کبھی کبھی جان جوکھم میں ڈالنی پڑتی ہے۔

پھر امن اور جنگ کا مسئلہ ایسا متنازع فیہ بھی نہیں ہے۔ اگر زندگی اور موت کے سوال میں کوئی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا تو امن اور جنگ کے بارے میں بھی غیر جانب داری کا بھرم قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ استاد کی ذمے داری نئی نسل کے لیے ہے پروان چڑھتی ہوئی انسانیت کے لیے ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کا فیصلہ اور اُن کا فکر و عمل بڑی حد تک استاد کی رہنمائی کا رہین منت ہوتا ہے۔ استاد اپنی اس اہم ذمے داری سے ہرگز فرار نہیں کر سکتا۔ اُسے نئی نسل کو امن سے محبت اور جنگ سے نفرت کرنی سکھانی ہے کہ یہ دراصل زندگی سے محبت اور موت سے نفرت کے ہم پلہ ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے دیس میں بھی بعض دوسرے دیسوں کی طرح بیشتر استاد اپنے اس فرض سے باخبر نہیں ہیں۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں آج بھی جنگ اور امن کے بارے میں عام طور پر غلط رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں

کی بے فکری کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ کا اِس وقت کوئی خطرہ نہیں ہے اور جنگ بازوں کی دھمکیاں گیدڑ بھبکی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور دوسرے لوگ وہ ہیں جو جنگ کو موت کی طرح یقینی سمجھتے ہیں اور اُس کے روکنے کی جدوجہد کو کارِ عبث سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ دونوں رجحانات امن کے معاملے میں ہماری بے عملی کا سبب بنتے ہیں۔ ہمیں نہ تو جنگ کے خطرے سے شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کرلینی چاہییں اور نہ ہی اُسے ایک لازمی امر سمجھ کر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول جانے چاہییں۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جنگ کے خطرے کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کریں اور اس یقین کے ساتھ جدوجہد کریں کہ جنگ کو ضرور روکا جا سکتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں دنیا کے تمام جمہوریت پسند معلمین نے اپنے فکر و عمل سے جنگ کی مخالفت کی ہے۔ ہمارے دیس کے مایۂ ناز معلم اور شاعر ربیندر ناتھ ٹیگور نے جاپانی جنگ بازوں کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے جاپان کے فاشسٹ نواز شاعر ناگوچی کو جو خط لکھا تھا وہ معلم کی امن دوستی کی ایک شاندار مثال ہے۔ اسی طرح پچھلی جنگ کے دوران میں فرانس اور دوسرے ممالک کے کتنے اساتذہ نے جنگ بازوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان تک دے دی۔ اسی طرح آج بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں حتیٰ کہ امریکا میں بھی بہت سے استاد دار و رسن کی آزمائش کے باوجود جنگ

کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ ان کی روشن مثالیں تمام معلمین کے لیے شمع راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آج استاد کا سب سے اہم مقولہ "تعلیم برائے امن" ہونا چاہیے۔ اسے خود بھی جاننا چاہیے اور طلبہ کو بھی آگاہ کرنا چاہیے کہ امن عالم کو کن قوتوں سے خطرہ ہے۔ اور ان کا توڑ کیا ہے۔ تمام ملکوں کے عام لوگ امن اور اطمینان کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ سب امن کے مورچے کے سپاہی ہیں۔ ان کو سمجھنا اور ان سے محبت کرنا تعلیم کا ایک اہم مقصد ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ملکوں کے رول کو بھی سراہنا چاہیے جہاں پُرامن محنت اور تعمیری کام کو زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا گیا ہے۔ جہاں لوگ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے قدرتی طاقتوں پر قابو پانے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ جہاں عوام کی مادی اور تہذیبی زندگی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور جہاں جنگ کا پروپیگنڈا قانوناً ایک سماجی جرم سمجھا جاتا ہے، جس کے لیے مجرم کو دس سال کی قید بامشقت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے تمام سوشلسٹ ممالک ہی نہیں بعض غیر جانب دار ملک مثلاً ہندوستان امن عالم کے پائیدار ستون ہیں۔ ان کی امن کی کوششوں کو تقویت پہنچانا ہمارے کا بڑا فرض ہے۔

سویت یونین کے نونہالوں اور نوجوانوں کا یہ سبق ہے کہ ہمارے لیے موت کے راستے پر چلنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے

علاوہ ایک اور راستہ ہے —— زندگی کا راستہ۔"

یہ سبق اُس عمر میں بچے کے سبق سے کتنا مختلف ہے جو غشی کے عالم میں رٹ لگائے ہوئے تھا کہ "میں ہٹلر کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔"

تعلیم کا راستہ موت کا راستہ نہیں بلکہ زندگی کا راستہ ہے۔ جنگ کا جان لیوا صحرا نہیں بلکہ امن کی جاں فزا وادی ہے۔ ہم سب کو زندگی کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

۶- ہماری تہذیب

تہذیب یا کلچر کیا ہے، اس بارے میں لوگوں کی الگ الگ رائیں ہیں۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ تہذیب آدمی کے رویے اور برتاؤ کی اچھائیوں کا نام ہے، جسے اخلاق بھی کہتے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ تہذیب نچوڑ ہے ان تمام قدروں کا جو انسان کو ہمیشہ عزیز رہی ہیں مثلاً نیکی، پاکیزگی، سچائی وغیرہ۔ بعض کے نزدیک تہذیب اتنی شخصی چیز نہیں ہے جتنی کہ سماجی اور یہ عبارت ہے کسی قوم کے رسم و رواج، رہن سہن اور علمی اور فنی سرمایے سے۔

یہ تمام تصورات تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرور روشنی ڈالتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تہذیب کی پوری تصویر پیش نہیں کرتا۔ دراصل تہذیب پھل ہے کسی قوم کے افکار، اعمال اور محسوسات کا۔ تہذیب پوری زندگی کا مظہر ہے۔ ان میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق سوچ بچار اور ذہنی کاوش سے ہے اور وہ چیزیں بھی جو عملی جدوجہد کا نتیجہ ہیں، نیز وہ چیزیں بھی

جو انسان کے احساسات اور جذبات سے متعلق ہیں۔

مادی لحاظ سے دیکھیے تو تہذیب مشینوں اور اوزاروں، مکانوں اور بستیوں، لباسوں اور زیوروں، کتابوں اور تصویروں وغیرہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اور اگر روحانی اعتبار سے نظر ڈالیے تو تہذیب کے مظاہر کی حیثیت سے ہمارے سامنے علوم و فنون، اقدار، خیالات، تصورات، قوانین وغیرہ ابھرتے ہیں۔

تہذیب کا رنگ روپ چاہے کچھ بھی ہو، اس کی تخلیق کا سہرا ہمیشہ انسانی محنت کے سر ہوتا ہے۔ تہذیب دراصل کرشمہ ہے انسان کی جدوجہد کا، اس کے کام کرنے کی صلاحیت کا، اس کی اس بے پناہ طاقت کا جس کی بدولت وہ قدرت پر قابو پاتا ہے، اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھالتا ہے اور اس میں سے نئی نئی چیزیں پیدا کرتا ہے۔

مگر انسان کبھی اکیلا کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کا طریقہ کیا ہوگا اور کام کے پھل کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ اس کا دارومدار سماج کے ڈھانچے پر ہے۔ سماج کی جیسی تنظیم ہوگی، اسی کے مطابق کام کے طور طریق اور کام کرنے والوں کے باہمی رشتے ہوں گے۔ گویا تہذیب سماجی نظام کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اگر تہذیب کی بنیاد یعنی کام کے طور طریق اور سماجی رشتے بدل جائیں تو سماج کا ڈھانچہ بھی بدل جائے گا اور تہذیب میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ اس

نظر سے دیکھیے تو تہذیب کوئی ایسی سماجی میراث نہیں ہے جو اپنی صورت و معنی کے لحاظ سے ہمیشہ یکساں رہتی ہے بلکہ وہ ایک بدلنے والی چیز ہے، جو پیداوار کے طور طریق اور سماجی رشتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنا چولا بدلتی رہتی ہے

آیئے! اب ذرا اس روشنی میں اپنی موجودہ تہذیب کی چھان بین کریں اور دیکھیں کہ اس کی کیا خصوصیات ہیں اور موجودہ صورت حال میں اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

آج ہمارے دیس کی پیداوار میں سب سے زیادہ اہمیت کھیتی باڑی کو حاصل ہے۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ زراعت یا زراعت سے متعلق دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے اور یہ سارے کام نیم جاگیری نظام کے ماتحت ہوتے ہیں جو صدیوں سے یہاں پیر جمائے ہوئے ہے۔ یہ نظام ہمارے ملک کی پیداوار کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس سے ہماری قومی زندگی میں غریبی اور تنگ دستی کے سائے دن بدن لمبے اور گہرے ہو رہے ہیں۔ بھوک، ننگ اور اپاہج جنتا طرح طرح کے بوجھوں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ اس کے جسم میں بھانت بھانت کی جونکیں لگی ہوئی ہیں جو ہر وقت اس کا خون چوستی رہتی ہیں۔ آزادی کے بعد قومی دولت میں جو اضافہ ہوا ہے، اس سے فائدہ اونچے طبقوں کو پہنچا ہے اور اونچے اور نیچے طبقے کے درمیان خلیج اور زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔

یہ جاگیری نظام مدت ہوئی ہمارے سماج کے پیر کی بیڑی بن چکا ہے۔ یہ ہماری زندگی میں فراوانی اور بلندی کے بجائے کم مائیگی

اور پستی پیدا کر رہا ہے۔ یہ نشانیاں ہیں اس نظام کے بوسیدہ ہونے کی۔ لیکن یہ نظام کسی نہ کسی طرح پھر بھی جیے جا رہا ہے۔ اس کی یہ غیر فطری زندگی در اصل اس سہارے کی رہین منت ہے جو اسے برطانیہ کی سامراجی طاقت نے دیا تھا۔ برطانوی سامراج نے اپنی اقتصادی ضرورتوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ہندوستان میں نہ صرف جاگیرداری کی سنستا کو زندہ رکھا بلکہ اسے نئی نئی شکلیں دے کر طاقت ور بنانے کی تدبیریں بھی کیں۔ ورنہ یہ کبھی کی اپنی فطری موت مر چکی ہوتی۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات کا ہماری تہذیب پر کیا کچھ اثر پڑا ہے۔ جاگیری نظام نے زندگی میں جمود، بے حسی اور ایک خواب کی سی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے انسان کی تخلیقی اور تعمیری قوتیں ابھرنے کے بجائے گھٹ کر رہ گئی ہیں۔ کال اور بیماریوں کی کثرت نے انسان میں بے بسی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے اور اسے قسمت پرستی کے چکر میں ڈال دیا ہے۔ جاگیری ماحول کے چھوٹے بڑے خداؤں کے سامنے ناک رگڑتے رگڑتے وہ اپنی انسانیت کے احساس کو بھی کھو بیٹھا ہے۔ وہ جہالت، توہم پرستی اور تعصب کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہے اور مردہ روایات کے بتوں کو اس آس سے پوجتا ہے کہ شاید اسی میں اس کی نجات ہو۔ کبھی جاگیری نظام کے رکھوالے مذہب اور پرانی تہذیب کے نام لیوا لوگوں کو "روشن ماضی" کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں تو وہ بھیڑوں کی طرح دیوانہ وار ادھر چل دیتے ہیں۔ اور کبھی یہی مرشدان خود میں

لوگوں کو دنیائے فانی کی ہر چیز سے بے تعلق کا درس دے کر عالم جاودانی کا سبز باغ دکھاتے ہیں تو وہ صبر و شکر کے نشے میں سرشار ہو کر گوشۂ تنہائی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی بدحالی میں بظاہر مگن نظر آتے ہیں۔ بہرحال انھیں جد و جہد کا وہ راستہ دکھائی نہیں دیتا جو خوش حالی اور فراوانی کی طرف جاتا ہے۔

اس بے رحم سماجی نظام کے مارے ہوئے انسان کی تصویر ہماری تہذیب کے ہر پردے پر دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے علوم و فنون میں اس کی جھلکیاں کہیں صاف اور واضح ہیں تو کہیں دھندلی اور مدھم۔ لیکن ہمارے ادب پر اس کا نقش بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے ادب میں انسان کی بے بسی اور بے مائیگی کا اتنا رونا رویا گیا ہے جیسے وہ ایک جابر اور ظالم قسمت کے سامنے بالکل مجبور ہے اور کسی طرح بھی اپنی مصیبتوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اسی طرح ہمارا ادب توہم پرستی، قدامت پرستی اور احیا پرستی کے رجحانات کا بھی حامل ہے۔ ہمارے کتنے ہی مصنف اور فن کار ان رجعت پسند نظریات کے مبلغ ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے تعلیمی ادارے اپنی درسی کتب اور پروگرام کے ذریعے بسا اوقات ان رجحانات کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

اس قسم کے زہریلے خیالات کو فروغ دینے اور ہماری تہذیبی زندگی کو نیچی سطح پر رکھنے میں سامراجی طاقتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سامراج کے اقتصادی اور سیاسی مقاصد صرف اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب دوسرے ملک ان کے دست نگر ہوں اسی لیے وہ تمام پس ماندہ ملکوں کو بلا واسطہ یا بالواسطہ اپنے شکنجے میں رکھنے کی کوشش

کرتا ہے۔ چنانچہ سامراج ہمیشہ ہماری صنعتی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا رہا ہے۔ اور آج جو ہماری زراعت کو فروغ دینے کے لیے سامراج بظاہر پُرخلوص پیشکش کر رہا ہے وہ دراصل ایک سوچی سمجھی چال ہے۔ ہمارے اقتصادی نظام کو پچھڑا ہوا رکھنے کی۔ اس طرح ہماری صنعتی ترقی کا سوال پس پشت پڑ جاتا ہے اور ہمارے ہاں سامراجی لوٹ کھسوٹ کے لیے موافق حالات بدستور قائم رہتے ہیں۔

ہمیں گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے سامراج مادی طور و طریق کے علاوہ تہذیبی ذرائع بھی استعمال کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں فلموں، کتابوں اور رسالوں کے ذریعے مختلف قسم کے رجعت پسند نظریے پھیلائے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے شعور کو پست، احساس کو کُند اور عمل کو بے اثر بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے تہذیبی ادارے — مدرسہ، سینما، ریڈیو، پریس وغیرہ سامراج کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ ادارے ہماری زندگی میں امید، خوشی اور بلند حوصلگی کے دیے جلاتے، لیکن وہ مختلف قسم کے سامراجی افکار کے ماتحت ہمارے چاروں طرف مایوسی، افسردگی اور شکست خوردگی کا اندھیرا طاری کر رہے ہیں۔ سب کی بھلائی کے لیے اجتماعی جدوجہد کا درس دینے کے بجائے انفرادیت پرستی اور خود غرضی کی تلقین کر رہے ہیں یا کسی فوق البشر یا مردِ مجاہد کے تصور سے عوام میں کم مائیگی اور بے بسی کا احساس پیدا کر رہے ہیں۔

ہماری تہذیبی زندگی پر سامراج کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ ہماری قومی ترقی کے حق میں بہت مضر ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اس بات سے

لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری صنعتی ترقی نے ہماری تہذیب کو کتنا کم متاثر کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو تھوڑی بہت صنعتی ترقی ہمارے دیس میں ہوئی ہے اس سے ہماری قومی تہذیب میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے عوام اب بھی فرسودہ جاگیری رشتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کو فروغ تو ضرور ہوا ہے لیکن آزادی کے ساتھ نہیں، جیسا کہ یورپ اور امریکا میں ہوا تھا۔ ہمارے ہاں سرمایہ داری ہمیشہ بیرونی سامراج کے چنگل میں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تہذیب میں سائنس اور عقل کا اتنا دخل نہیں ہوا ہے جتنا مغربی تہذیب میں سرمایہ داری کے عروج کے دور میں تھا۔ البتہ ہمارے دیس میں سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے علوم و فنون پر یورپ کے لبرل اور سائنسی تصورات کا ایک حد تک اثر ضرور پڑا ہے۔ آزادی، مساوات اور جمہوریت کی لہروں نے ہماری ساکن تہذیب میں تھوڑی بہت ہلچل تو یقیناً پیدا کی لیکن یہ ہلچل صرف اوپری سطح تک محدود رہی۔ گہرائی تک نہیں پہنچ سکی۔ ہمارے سماج کا صرف ایک چھوٹا سا اعلیٰ طبقہ جسے تہذیبی اور تعلیمی سہولتیں حاصل تھیں، اس سے براہ راست حرکت میں آیا۔ لیکن ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ اس سے پورے طور پر متاثر نہ ہو سکا کیونکہ ہندوستان میں جب سرمایہ داری نے انیسویں صدی کے آخری حصے میں آنکھیں کھولیں تو اس کی نشوونما کے راستے میں مغربی سرمایہ داری کا بھیانک بھوت جارحانہ سامراج کی شکل میں منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ سامراج کے وجود کے لیے ان نئے تصورات کی صحت بخش غذا زہر کا اثر رکھتی تھی۔ اس نے سامراج

نے نہ صرف ان خیالات کو عام ہونے سے روکا بلکہ ان کی اصلی صورت کو بھی مسخ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تہذیب ان خیالات کے سہارے آگے نہ بڑھ سکی اور اس میں اب بھی غلامی، ذات پات اور چھوا چھوت کے رجحانات کارفرما ہیں اور سائنسی طرز فکر کے بجائے توہم پرستی اور تاریک اندیشی کا دور دورہ ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری تہذیب کا کوئی روشن پہلو نہیں ہے۔ ہمارے سماج کے اندر وہ طاقتیں برابر ابھر رہی ہیں جو ایک نئی حیات پرور تہذیب کی نقیب ہیں۔ جاگیرداری کے بوجھ سے دبے ہوئے عوام اپنی آزادی اور خوش حالی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ جنتا سامراج کے ظلم و تشدد سے صرف بیزار ہی نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف برسرِ پیکار بھی ہے۔ عوام کی صفوں میں جس قدر یک جہتی اور مضبوطی پیدا ہوتی جاتی ہے، اسی قدر انھیں اپنی فتح کا یقین ہوتا جاتا ہے اور ان کی جد و جہد اور تیزی سے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا شعور پروان چڑھتا جاتا ہے اور دل نئی امنگوں اور صحت مند احساسات سے معمور ہوتا جاتا ہے۔

جہاں ہماری تہذیب میں سڑے گلے جاگیری نظام اور مضمحل سامراج کے سائے نظر آتے ہیں وہاں ایک ابھرتے ہوئے توانا سماجی نظام کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص ہمارا ترقی پسند ادب اس رجحان کا آئینہ دار ہے۔ یہ ادب تہذیب کے ان عناصر کے خلاف آواز اٹھاتا ہے جو جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراج کو تقویت پہنچاتے ہیں اور تہذیب کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو آزادی، جمہوریت

اور خوش حالی کی جدو جہد میں محنت کش عوام کی ہمت بڑھاتے اور رہنمائی کرتے ہیں۔

اب ہماری تہذیبی ترقی کی کیا سمت ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں ترقی کا ایک واضح رُخ یہ ہے کہ اپنی تہذیب کو سامراجی اثرات سے آزاد کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تہذیب کا رنگ روپ قومی ہونا چاہیے اس کے لیے عالمی تہذیب (cosmopolitanism) کی سی سامراجی تحریکوں کے خلاف جدو جہد کرنی پڑے گی۔ جو بظاہر نیک یا بے ضرر معلوم ہوتی ہیں لیکن جن کا اصل مقصد پس ماندہ ملکوں پر سامراجی تہذیب کو مسلط کرنا ہے۔

لیکن قومی تہذیب کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ پورے ملک میں ہر لحاظ سے تہذیبی یکسانی ہو، جیسی کہ اس وقت ہمارے ملک میں زبان کے معاملے میں کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف خطوں کی الگ الگ زبانیں ہیں، قومی تہذیب کے نام پر کسی بھی زبان کو دبانا نہ صرف غیر جمہوری اور نامنصفانہ فعل ہے بلکہ تہذیب پر بھی بہت بڑی چوٹ ہے کیونکہ زبان تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی تمام زبانوں کو پورے طور پر پھلنے پھولنے کی سہولتیں اور آسانیاں مہیا کی جائیں۔

قومی تہذیب کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہمیں ماضی سے جو کچھ تہذیبی میراث ملی ہے، اسے ہم جوں کا توں سینے سے لگائے پھریں۔

ہمیں اس ورثے میں سے صرف اُسی حصّے کو اپنانا چاہیے جو صالح اور جاندار ہے۔ جس نے انسانی زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ جس سے انسان دوستی کی روایات وابستہ ہیں اور اس حصّے کو ترک کر دینا چاہیے، جو گھٹیا اور بے جان ہے، گھناؤنا اور سڑا ہوا ہے۔

اسی طرح قومی تہذیب سے یہ بھی مراد نہیں ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کی تہذیبوں سے ناتا توڑ لیں، بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم دوسری تہذیبوں کے صحت مند اور ترقی پسند عناصر کو اپنی سماجی ضرورتوں اور تاریخی مطالبوں کے مطابق جذب کر لیں۔ اس کے بغیر ہماری تہذیب موجودہ دور کے تقاضوں کو پیدا نہ کر سکے گی۔

ہماری تہذیب کی ہیئت تو قومی ہوگی، لیکن اس کی روح سوشلسٹ۔ اس کی تہذیب پر فقط مٹھی بھر لوگوں کا اجارہ نہیں بلکہ سب کا تصرف ہونا چاہیے۔ صرف وہی تہذیب عوام میں مقبولیت حاصل کر سکے گی جو ان کے مفاد کو سامنے رکھے گی، جو ان کی خوش حالی کی ضمانت کرے گی اور جو ان کے شعور اور سوجھ بوجھ کے مطابق ہوگی۔ اس لیے تہذیب کو سوشلسٹ بنانے کی خاطر تہذیب کے ذرائع کو عوام کے قریب لانا ہوگا۔ خاص طور پر زبان اور طرزِ بیان میں بڑی اصلاح کرنی پڑے گی تاکہ تہذیب کو عوام تک پہنچایا جا سکے۔ تعلیم کا ایک جامع ترقی پسند نظام قائم کرنا ہوگا جس سے عوام فائدہ اٹھا سکیں۔

ہماری تہذیبی ترقی کا ایک اور اہم رُخ ہے۔ اب تہذیب اُس وقت تک نہیں پنپ سکے گی جب تک اس کی بنیاد سائنس پر نہیں رکھی جاتی۔ اس کے معنی ہیں کہ ہمیں جاگیری دور کی مروجہ توہم پرستی اور سامراجی دور کی نامعقولیت پسندی اور حنفیت پرستی کے خلاف برابر جدو جہد کرنی ہوگی۔ ٹھوس واقعات کی روشنی میں سچائی کی کھوج کرنی پڑے گی۔ اندھی عقیدت پرستی کے بجائے مشاہدے اور تجربے کو شمع راہ بنانا ہوگا اور چھان بین اور جانچ پرکھ پر عمل کی بنیاد رکھنی پڑے گی۔

اس طرح جو قومی اور سائنٹفک تہذیب اُبھرے گی وہ عوام میں خود اعتمادی پیدا کرے گی۔ ان کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لائے گی اور انھیں توہمات کی دلدل سے نکال کر ٹھوس زمین پر قدم بڑھانے کا موقع دے گی۔

۷۔ قومی نظامِ تعلیم

قومی نظامِ تعلیم قائم کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئی ہیں، آیئے، پہلے ان پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ برطانوی دورِ حکومت میں جب ہماری معیشت کا زوال ہوا اور عوام ایک سخت معاشی بحران میں مبتلا ہو گئے، تو پورے ملک میں ایک بے چینی پھیل گئی اور اس سے قومیت کا شعور بیدار ہوا۔ ملک کے نوجوانوں میں قومیت کے احساس کو اُجاگر کرنے کے لیے مختلف سماجی، سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اُبھرنے لگیں۔ انھیں تحریکوں کے اثر سے انیسویں صدی کے نصف سے ہی ملک میں بعض ایسے تعلیمی ادارے قائم ہونے شروع ہو گئے، تھے جن میں کسی حد تک قومیت کی روح کارفرما تھی۔ دراصل اس وقت سے ہمارے ملک میں ایک قومی نظامِ تعلیم کے قیام کا برابر خیال رہا ہے لیکن یہ ابتدائی کوششیں قومی نظامِ تعلیم کے کسی واضح تصور پر مبنی نہیں تھیں۔ یہ فخر تو بنیادی قومی تعلیم کو حاصل ہے جو گاندھی جی کی رہنمائی میں ایک اسکیم کے طور پر ۱۹۳۷ء میں پیش کی گئی۔ دراصل یہ پہلی کوشش ہے جس میں قومی نظامِ تعلیم کے

کے خدوخال واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن باوجودیکہ آزادی کے بعد ہندوستان کی مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے تعلیم کی ابتدائی منزل پر بنیادی تعلیم کو قومی تعلیم کی حیثیت سے منظور کر لیا ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بنیادی تعلیم نے اب تک بہت کم ترقی کی ہے۔ جہاں تک ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے ان پر غور و خوض کے لیے حکومت ہند کی طرف سے الگ الگ کمیشن مقرر ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی کمیشن قائم کیا گیا اور ۱۹۵۲ء میں سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن پھر تعلیم کی تمام منازل اور اقسام پر غور و بچار کرنے کے لیے ۱۹۶۴ء میں ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا گیا مگر ابھی تک عملاً تعلیم کے بنیادی ڈھانچے میں کسی منزل پر بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور آج ہمیں کوئی بھی ایسا نظام نظر نہیں آتا جس کو قومی نظامِ تعلیم کہا جا سکے۔

ہمارے ملک میں بعض با اثر لوگ ایسے ملیں گے، جو اس بات کے حق میں ہیں کہ پورے ملک میں تعلیم کا ایک ہی نظام قائم ہونا چاہیے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی مخصوص منزل سے متعلق ملک کے تمام تعلیمی ادارے نہ صرف یکساں معیارِ تعلیم رکھیں بلکہ ہر معنی میں یکساں ہوں۔ مثلاً مختلف منزلوں پر تعلیم کی مدت، نصاب تعلیم، درسی کتابیں، طریقۂ تعلیم، تنظیمی اور انتظامی معاملات سبھی ایک سے ہوں۔ قومی نظام تعلیم کا اگر یہی تصور ہو تو پھر لازمی طور پر کل تعلیم مرکزی حکومت کے دائرۂ عمل میں آجائے گی، چاہے تعلیم پر براہ راست مرکزی حکومت کا کنٹرول ہو اور چاہے مرکزی حکومت کی طرف سے ریاستی

حکومت اس کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے ایسا نظام لچک دار نہیں ہو سکتا۔ اس کے تحت مقامی ضرورت اور مفاد کو مدنظر رکھنا مشکل ہو جائے گا، ایسے نظام میں اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ وہ آمریت کا انداز اختیار کر لے اور اس میں شخصی آزادی اور اُپج کی گنجائش بہت کم رہ جائے اور ایک جامد نظام تعلیم قائم ہو جائے۔

ایسے نظام میں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ اگر کہیں مرکزی پالیسی میں کوئی غلطی ہو جائے تو پورا ملک اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور پوری قوم اس کا نقصان اٹھائے گی اس لیے کہ ایسے نظام میں غلطی کی اصلاح کرنے میں دیر لگے گی۔ ہمارے ملک میں ایسا نظام نہ تو ممکن ہے اور نہ پسندیدہ، کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف تہذیبوں کے علمبردار ہیں اور ترقی کی مختلف منزلوں پر ہیں، اور اس وجہ سے ملک کے تمام لوگوں کی تعلیمی ضرورتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔

ایسی صورت میں قومی نظام تعلیم کیا ہو؟ دراصل قومی نظام تعلیم کا تعلق ان اغراض و مقاصد سے ہونا چاہیے، جن کو ملک نے اپنے لیے متعین کیا ہے۔ تعلیم کی ہیئت، تنظیم اور اس کی تکنیک ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے ایک طرف اس بات کی ضمانت ہوگی کہ تعلیمی مقاصد کے معاملے میں سارا ملک متفق ہے اور دوسری طرف یہ فائدہ ہوگا کہ مقامی حالات اور ضروریات کے مطابق تعلیم کے طریقہ کار میں ترمیم و تنسیخ بھی کی جا سکے گی، ایسی صورت

میں مختلف علاقوں کے لوگ اپنی آواز اور اُپج اور سوجھ بوجھ کو بروئے کار لاسکیں گے۔ اس کے علاوہ ایک اچھائی کی بات یہ بھی ہے کہ اگر پالیسی بنانے والوں سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا جلد تدارک ہو سکے گا اور پورے ملک کو کوئی بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

کسی بھی اُبھرتے ہوئے سماج میں تعلیم کو ایک اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا منصب صرف یہی نہیں ہے کہ ان اثرات کو مستحکم بنائے جو سماجی محرکات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ وہ ان طاقتوں کی معاون و مددگار بھی ثابت ہو، جو سماج میں صحت مند تبدیلیاں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس طرح تعلیم کو سماجی تبدیلیوں کا ایک آلۂ کار بھی ہونا چاہیے لیکن تعلیمی ادارے یہ کام محض اسی وقت ہی کر سکتے ہیں۔ جبکہ سماجی تغیر کی سمت واضح طور سے متعین ہو۔ ہندوستان میں خوش قسمتی سے اس سمت کا تعین ہو چکا ہے۔ ہمارا ملک سوشلسٹ قسم کی سماجی تشکیل کی طرف گامزن ہے۔ گو کہ رفتار بہت سست ہے اور طرح طرح کی اکاوٹیں درپیش ہیں پھر بھی ہم ایک ایسے سماج کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں جو ملک کے مادی اور تہذیبی وسائل کو مسلسل ترقی دے سکے تاکہ ملک کے ہر فرد کو ایک مہذب اور خوشگوار زندگی کی برکتوں سے مالا مال کیا جا سکے۔ یہ صرف ایک ایسے سماج میں ممکن ہے جو نہ صرف مادی اور تہذیبی ضروریات کو پیدا کرنے کے ذرائع اور وسائل کی توسیع برابر کرتا رہے، بلکہ وہ ان وسائل کی تقسیم

کا بھی مناسب انتظام کرے تاکہ پورا سماج مادی اور تہذیبی برکتوں سے فیضیاب ہو سکے۔

اگر ہم اپنے پنج سالہ منصوبوں کا جائزہ لیں تو ہمیں ان مقاصد کی نشان دہی ملتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان منصوبوں میں ان ہی مقاصد کے پیش نظر پیداوار کے میدان میں پبلک سیکٹر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عوامی فلاح اور بہبود کا رجحان ان منصوبوں میں خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اشتراک عمل اور اتحاد باہمی کی اہمیت کا احساس نہ صرف پیداواری حلقے میں بڑھ رہا ہے بلکہ سماجی زندگی کے میدان میں بھی اس پر زور دیا جا رہا ہے۔ امداد باہمی کی تحریک اور پنچایت راج کے اداروں کا قیام اس کی دو بڑی مثالیں ہیں۔

ہمارے دیس میں سماجی تبدیلیوں کی سمت کیا ہے اور کس قسم کا سماج ابھر رہا ہے اس کا اندازا کسی حد تک مندرجہ بالا بحث سے کیا جا سکتا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے مقاصد ہیں جو ہندوستان کے قومی نظام تعلیم کے قیام میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں سوشلسٹ قسم کی سماجی تنظیم کا تقاضا ہے کہ جمہوریت، سیکولرازم اور قومی یک جہتی کو خاص طور پر قومی نظام تعلیم میں جگہ دینی چاہیے۔ اب اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں ہر ایک کے متعلق تعلیم کے کیا فرائض ہیں۔

یوں تو تعلیم کے میدان میں جمہوریت کے بہت سے تقاضے

ہیں لیکن یہاں صرف چند کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ملک کے ہر فرد کو تعلیم کے مساوی مواقع بہم پہنچائے جائیں کیونکہ اس کے بغیر نہ تو شہریت کے حقوق و فرائض کا احساس ہو سکے گا اور نہ جمہوریت کا قیام۔ یہ اصول اتنا اہم ہے کہ اسے ہر ایک جمہوری ریاست میں دستوری حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ دستور ہند کی دفعہ نمبر ۴۵ میں ہدایت کی گئی ہے کہ دستور کے نفاذ کے دس برس کے اندر ریاست کو چودہ برس تک کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے مطابق ۱۹۶۰ء تک ہندوستان کے تمام بچوں کے لیے عام تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ اتنا بڑا کام ہے اور ترقی کی رفتار اتنی سست اور وسائل اتنے محدود ہیں کہ ۱۹۷۰ء سے پہلے اس کی تکمیل ناممکن معلوم ہوتی ہے بلکہ ابتدائی تعلیم کے معاملے میں بعض پچھڑی ہوئی ریاستوں مثلاً یو۔پی، بہار وغیرہ میں اس صدی کے اختتام تک بھی اس کی تکمیل مشکل ہوگی۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس معاملے میں مرکزی حکومت کی طرف سے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ یہ اقدامات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ مختلف ریاستوں کی تعلیمی حالت میں بہت تفاوت ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی ریاست کی آبادی کے مختلف حصّوں میں تعلیمی لحاظ سے بہت فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً طبقۂ نسواں، پس ماندہ فرقے، ہریجن اور مختلف قبائل تعلیمی ترقی کی راہ میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ یہ خلیج اسی وقت پُر ہو سکتی ہے جب کہ ان پس ماندہ لوگوں

کی تعلیمی سطح کو اونچا کرنے کے لیے قومی پیمانے پر خاص کوشش کی جائے۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ عوام میں تعلیم کے ذریعے ایسے رجحانات، سمجھ بوجھ، عادات واطوار اور خصوصی صلاحیتیں پیدا کی جائیں جو جمہوری طرز زندگی کی روح رواں ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ نصابِ تعلیم، درسی کتابیں اور پیرا تعلیمی پروگرام اسی کے مطابق ڈھالا جائے۔ ایک ایسی قوم کے لیے جس میں مختلف تہذیبی، مذہبی اور لسانی فرقے ہوں یہ بہت ہی ضروری ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں صحیح رواداری پیدا ہو اور وہ ان اختلافات اور امتیازات کے باوجود یگانگت محسوس کر سکیں اور اس جذبے سے سرشار ہوں کہ اس ملک کی خوش حالی اور ترقی میں سب کی ذمے داری ہے اور سب برابر کے شریک ہیں۔ اس کی اہمیت موجودہ صورت حال میں بہت زیادہ ہے کیونکہ ہمارے بعض تعلیمی پروگراموں میں "شاونیت" کی حد تک تعصب کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ درسی کتابوں میں بھی کبھی کبھی دوسرے فرقوں کے لیے اگر نفرت نہیں تو کمتری کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ لہٰذا یہ بہت ضروری ہے کہ طالب علموں میں قطع نظر اس کے کہ وہ کس مذہب، نسل، رنگ، زبان یا خطے سے تعلق رکھتے ہیں باہمی عزت واحترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

جمہوریت کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ہم میں من حیث القوم ذمے داری کا بہت کم احساس ہے۔ کام چور اور

خود غرض افراد کبھی بھی جمہوریت نہیں قائم کر سکتے۔ لہٰذا ہمارے تعلیمی اداروں میں ایسے مواقع فراہم کرنے چاہییں کہ طلبا میں ذمے داری کا احساس پیدا ہو، تاکہ وہ آیندہ قوم کی ذمے داریوں کو نبھانے کے قابل ہو سکیں۔

چونکہ معاشی ترقی ایک خوش گوار زندگی کے لیے لازمی چیز ہے اس لیے تعلیمی پروگرام میں اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ طالب علم نہ صرف ایسی تربیت حاصل کریں جو ملک کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے بلکہ ان میں ان کاموں کی طرف ایک صحیح رجحان بھی پیدا ہو جو ملک کی خوش حالی کے ضامن ہیں۔ دراصل محنت کے احترام کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

دستوری حیثیت سے ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے لیکن ہماری تاریخ نے ہمارے لیے ایک ایسا ورثہ چھوڑا ہے جو سیکولرازم کی روح کے منافی ہے اور ہم ابھی تک اس کی گرفت سے نکل نہیں سکے۔ آج بھی دیس میں ہر قسم کے فرقہ وارانہ، احیا پسند اور تاریک اندیش بظاہر پارسائی کے لباس میں جلوہ گر ہیں اور وہ سیکولرازم کے خلاف صف بستہ ہیں۔ یہ طاقتیں صرف سیاسی سطح پر ہی موجود نہیں ہیں بلکہ سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے تعلیم پر ان کا بہت گہرا اثر ہوگا۔ احیا پسندی اور رجعت پرستی کا یہ رجحان نہ صرف ان اداروں کے تعلیمی پروگرام پر حاوی ہے جن کو بعض مذہبی جماعتوں کی سرپرستی حاصل ہے، بلکہ ان اداروں میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

براہ راست حکومت کے زیرِ نگرانی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اداروں میں عظمتِ ماضی کے نام پر ہر قسم کی توہم پرستی اور قدامت پسندی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ سیکولرازم کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب ہے مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری؟ بعض آزاد خیالوں کے نزدیک سیکولرازم کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کسی خاص مذہب کی پشت پناہی نہ کی جائے۔ یہ ایک منفی مفہوم ہے۔ دراصل سیکولرازم کا تصور کچھ مثبت قدروں کا حامل ہے۔ یہ عوام الناس میں انسانی سماج اور فطرت کی طرف ایک استدلالی اور سائنسی رجحان پیدا کرتا ہے۔ دراصل سیکولرازم جدید طرزِ فکر کی روح ہے۔ آج دنیا میں مادی خوش حالی کا انحصار صنعتی ترقی پر ہے اور صنعتی ترقی سائنس اور ٹیکنولوجی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم چیز سائنس کی روح ہے جو ہر شہری کے طرزِ فکر اور طریقِ کار پر حاوی ہونی چاہیے تاکہ یہ ملک تعصب اور توہم پرستی کی گھٹن سے نکل کر عقل و دانش کی کھلی فضا میں سانس لے سکے۔ اور مادی اور تہذیبی ترقی کی منزل کی طرف تیزی سے قدم بڑھا سکے۔

کبھی کبھی ہمارے ملک کے بعض با اثر اور روشن خیال لوگ ہدایت کرتے ہیں کہ تعلیم کو ماضی کی روحانی اقدار کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہیے تاکہ دورِ حاضر کی مادیت پرستی کے سیلاب کو روکا جا سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حضرات مغربی سائنس اور ٹیکنولوجی کے دلدادہ بھی ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک میں ان کی ترقی ہو۔ بظاہر یہ

خیال بہت معقول معلوم ہوتا ہے لیکن اسی فلسفے سے رجعت پرستی کے چشمے بھی پھوٹتے ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ روحانیت کی پیروی اور مادیت کی مخالفت کا نتیجہ قدامت پرستی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ملک کی خوش حالی کی تدابیر کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رجحان ملک کے لیے بہت مضر ہے۔ ڈر ہے کہ ایسی تعلیم سے توہم پرستی کو فروغ حاصل ہوگا اور مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی طرف سے بے نیازی برتی جائے گی۔ موجودہ صورت حال میں یہ رجحان زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے کیونکہ بدقسمتی سے آج کل ہمارے ملک کی فضا اس کے لیے بہت سازگار ہے۔ ایسے خیالات کا پرچار کرنے سے اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ جدید طرز فکر اور سیکولرازم کی روح دب جائے گی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے ذریعے لوگوں میں سائنسی رجحان پیدا کیا جائے۔ اس سے ایک طرف وہ غیر منصفانہ امتیازات مٹ جائیں گے، جو ذات پات اور نسل و رنگ کی بنیاد پر قائم ہیں، اور دوسری طرف صحیح معنوں میں ہمارے ہاں سیکولر ریاست کا قیام عمل میں آسکے گا۔

قومی ترقی کے لیے قومی یک جہتی بہر کیف ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ تعلیم ہی اس کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مگر اس ضمن میں ابھی تک ان امکانات سے ہم پورے طور پر آگاہ نہیں ہیں جو تعلیم کی حدود کے اندر ہیں۔ دراصل قومی یک جہتی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، جب تک تمام لوگوں میں ملک سے وابستگی کا احساس نہیں ہوگا اور وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ اس ملک میں ان کی

جان، مال اور عزت محفوظ ہے اور ان کے لیے ذات پات، مذہب، زبان یا جائے سکونت کی بنا پر شخصی یا جماعتی ترقی کا کوئی راستہ بند نہیں ہے، اُس وقت تک قومی یک جہتی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ اس معاملے میں تعلیم کا ایک اہم منصب ہے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ دیس کی ایکتا کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک میں ایک ہی قسم کی تعلیم ایک ہی طریقے سے اور ایک ہی زبان کے ذریعے دی جائے، یہ بہت خطرناک تجویز ہے۔ اگر ہم مختلف فرقوں کے لسانی، تہذیبی اور مذہبی امتیازات کو نظر انداز کر دیں اور انھیں کسی ایک تعلیمی سانچے میں ڈھالنا چاہیں تو ڈر ہے کہ اس طرح نہ وطن سے وابستگی کا جذبہ پیدا ہو سکے گا اور نہ ذاتی تحفظ کا احساس پیدا ہوگا، بلکہ اس کے برعکس نتائج برآمد ہوں گے جب جماعت کی تہذیبی ضروریات کو نظر انداز کیا جائے گا۔ اس کے ذہن میں شکوک پیدا ہوں گے کہ قومی یک جہتی کے ذریعے اس کی تہذیب کو مٹایا جا رہا ہے۔ درصل یہ یگانگت کی راہ نہیں ہے بلکہ بیگانگی کا راستہ ہے۔ ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر قومی یک جہتی کا ایک ایسا ہمہ گیر تصور ہونا چاہیے کہ جس میں مختلف تہذیبوں کا ایک خوشنما سنگم ہو، گویا ایک ایسا مرقع تیار کیا جائے جس میں مختلف رنگ، اور مختلف شکلیں ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے کے حسن کو دوبالا کریں اور کثرت میں وحدت کا نمونہ پیش کریں۔

اسی لیے ہندوستان کے قومی نظام تعلیم میں اس بات کا پورا اہتمام ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے ہر تہذیب کی نشوونما ہو سکے۔

یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ مختلف علاقوں اور فرقوں کے زبان وادب، آرٹ، تاریخ اور فلسفے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ہم اپنے ہم وطنوں میں جذباتی ہم آہنگی صرف اسی طرح پیدا کر سکیں گے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا قومی نظام تعلیم ایک ایسا نظام ہوگا جو ان مقاصد کے حصول میں ہماری رہنمائی کر سکے، جن کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ اس نظام تعلیم کے تین ستون ہیں۔ جمہوریت، سیکولرازم اور قومی یک جہتی۔ یہ تینوں لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کے استحکام کی شرط ہیں۔ اگر یہ تینوں ستون اپنے اپنے بوجھ کو ٹھیک طور سے اٹھا سکیں تو یقیناً ہم اپنے ملک میں قومی نظام تعلیم کی ایک مضبوط عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔

۸۔ شہریت کی تعلیم

اس موضوع پر بحث کرنے میں آسانی ہوگی اگر ہم اسے چند خاص حصوں میں تقسیم کرلیں اور پھر ہر ایک حصّے سے الگ الگ بحث کریں۔ یہ حصے حسب ذیل ہیں۔

شہریت کا تصور انسان کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا؟ اس کی نشوونما کیونکر ہوئی؟ شہریت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے لیے کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیے؟ تعلیمی ادارے شہریت کی تعلیم کس طرح دے سکتے ہیں؟

ابتدائی انسان ہر طرح آزاد تھا۔ اس کی نقل و حرکت پر اگر کوئی قوت پابندی عائد کرتی تھی تو وہ تھا اس کا طبعی ماحول وہ اپنی ضرورتوں کو جس طرح چاہتا پورا کرلیتا تھا۔ جب اسے بھوک لگتی وہ کسی جانور کو مار کر یا کسی درخت کے پھل پتیاں توڑ کر اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ جب وہ تھک جاتا تو جہاں چاہتا لیٹ جاتا اور سو جاتا۔ غرض ساری دنیا اس کی تھی لیکن اس کا یہ حق بہت عرصے تک بلا شرکت غیرے قائم نہیں رہ سکا۔ جوں جوں

انسانی نسل میں اضافہ ہوتا گیا انسان کو اس بات کا احساس تیز سے تیز تر ہوتا گیا کہ دنیا کی چیزوں کے استعمال میں دوسروں کو شامل کرنا ناگزیر ہے۔ دراصل یہ ہی وہ احساس ہے جو ابتدا میں اجتماعی زندگی کا سبب بنا۔ اجتماعی زندگی کی نشوونما کے لیے انسان کو اپنے اوپر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ تھا شہریت کا پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ انسان نے عمر اور تجربے سے سیکھا کہ اس کے ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے۔ گویا کہ شروع میں جن ذمّے داریوں کا بوجھ انسان کے کندھوں پر پڑا وہ کسی بیرونی طاقت یا شخصیت نے اس پر زبردستی عائد نہیں کی تھیں بلکہ اس نے خود انھیں فردی بوجھ کر اپنے ذمّے لیا تھا لیکن جماعت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہریت کا رنگ روپ بھی بدلتا گیا۔ رفتہ رفتہ پوری جماعت کی باگ ڈور فردِ واحد کے ہاتھ میں آگئی جو سب سے طاقتور اور ذہین ہوا بس اس نے ساری جماعت کو اپنے حکم کے مطابق چلنے پر مجبور کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسان جو آزاد پیدا ہوا تھا اور شروع میں کچھ عرصے تک آزاد رہا بھی، رفتہ رفتہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اجتماعی زندگی نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔ کبھی پروہتی نظام قائم ہوا تو کبھی جاگیرداری۔ کبھی امپیریلزم نے زور پکڑا تو کبھی فاشزم نے۔ یہ سارے کے سارے نظام کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ اس وقت بھی دنیا کے بعض حصّوں میں غلامی کی رسم جاری ہے۔ جہاں آقا کے نزدیک غلام کی قدر

وقیمت ایک زر خرید مویشی سے زیادہ نہیں ہے۔ اب بھی کہیں کہیں جاگیرداری اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ پنجے جمائے ہوئے ہے۔ امپریلزم مختلف بھیسوں میں دنیا کے بیشتر حصے کو دن رات کھلے بندوں لوٹ رہی ہے اور فاشزم امپریلزم کی مد مقابل بن کر انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں اپنے حریف سے بازی لے جانے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے۔

ہر نظام اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر ضرور کرتا ہے۔ وہ افراد کے لیے خاص راستے بھی تجویز کرتا ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے انھیں ان راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک "شہریت" نام ہے ان بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی صفت کا۔ کسی نظام کی نظر میں اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس نظام کو سب سے اچھا سمجھے اور اس کی بقا کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کرے گویا اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد کو ایک ہی سانچے میں ڈھال کر ایک نمونے کا بنا دیا جائے اور اس طرح ایک بڑی حد تک انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔ غرض شخصی آزادی اور شہریت دو متضاد چیزیں ہیں لیکن ہے یہ بہت مضحکہ خیز اور نامعقول بات۔ وہ ریاستیں جو آج ایک خاص قسم کے انسان ڈھالنے کا کام بہت انہماک سے کر رہی ہیں، ان کے بڑے بڑے نامور فرزند جن کے نام آج بھی ان کی قومیں عزت و احترام کے ساتھ لیتی ہیں جن کے یوم پیدائش اور یوم وفات کو قومی تیوہار کا درجہ

حاصل ہے۔ اس ٹائپ سے بالکل مختلف ہے جس کے پیدا کرنے کی آج جدوجہد جاری ہے۔ اگر کسی شہری میں آزادی رائے اور آزادی عمل کی جھلک نظر آتی ہے تو اسے ریاست کچلنے کی کوشش کرتی ہے گو کہ یہ وہ خوبیاں ہیں جو کہ اسی ریاست کے گذشتہ نامور فرزندوں کی شخصیت کا بہت نمایاں حصہ تھیں۔ امریکہ والے ابراہم لنکن کا نام بہت عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ ان کے ہاں لنکن کی شان میں قصیدوں کے دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں لیکن وہاں آج ان لوگوں کو بلا تکلف جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے جن میں لنکن جیسے خیالات ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تمام مغربی ممالک حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن وہ اگر آج زندہ ہوتے اور اپنے اصول کے مطابق جنگ و جدل میں شریک ہونے کے خلاف آواز بلند کرتے تو ان کی جو گت بنتی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں یا تو انھیں کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہوتا جہاں ان کی آواز سننے والا بجز ان کی ذات اور ان کے خدا کے اور کوئی تیسرا نہ ہوتا یا پھر سرے سے ان کا حساب ہی بیباق کر دیا گیا ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی شہریت بحیثیت ایک آئیڈیل کے بہت ناقص چیز ہے کیونکہ اس سے تخلیق کے سارے سوتے بند ہو جاتے ہیں اور ذہنی طور پر انسان محض غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ ذہنی غلامی کبھی بڑے آدمی پیدا نہیں کر سکتی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی وجہ سے تو معمولی انسان بھی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی نہیں کر پاتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر قسم کی شہریت انسان کی ترقی کو روکتی ہے اور شہریت کی تعلیم لازمی طور پر گھٹیا اور پست قسم کے انسان پیدا کرتی ہے؟ نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اصل میں شہریت کا تعلق جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے سماجی نظام سے ہے۔ اگر کسی سماج میں ہمیشہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے بیج موجود ہیں، اگر وہ سمجھتا ہے کہ عوام کی ترقی اس کے لیے مضر ہونے کے بجائے مفید ہے تو وہ اپنے افراد کی انفرادیت کو دبا کر ختم کرنے کے بجائے ابھارنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اچھی طرح پھلنے پھولنے کے موقعے دے گا۔ وہ ان قوتوں کی سرکوبی کرے گا جو عوام کو ترقی کرنے سے روکتی ہیں جو انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ وہ ان پابندیوں کی تعداد کم سے کم کرے گا جن کا ماننا اور جن کے مطابق چلنا ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔ یہ پابندیاں ایسی ہوں گی جو اس کی نشوونما میں رکاوٹ ڈالنے کے بجائے معاونت کریں گی۔ اسے میں دو ایک مثالوں سے واضح کروں گا۔ سڑک کے ایک طرف چلنے کی پابندی نہ صرف دوسروں کے لیے مفید ہے بلکہ اس شخص کی حفاظت کی ضمانت کرتی ہے جو اس پابندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس طرح نہ صرف موٹر، بس اور تانگوں کو پیدل چلنے والوں کی وجہ سے رکاوٹ نہیں ہوتی بلکہ پیدل چلنے والا بھی سڑک کے حادثوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کو کام کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف ریاست کے لیے مفید ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور خود عیش سے زندگی

بسر کرنے کے خواہاں ہیں کیونکہ اس طرح ان کو بھی اپنی انفرادی خوبیاں اجاگر کرنے کا موقع ملے گا۔ ایسے ترقی پسند سماج میں اجتماعی زندگی کی خاطر انفرادی امتیازات کو فنا کرنے کے بجائے صحیح سمتوں میں ابھارا جائے گا۔ اگر شہریت کی تعلیم اس قسم کے سماج کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جائے تو انفرادی کلچر کی بہترین چیزوں کو قائم رکھنا ناممکن نہیں ہے لہذا شہریت کی تعلیم کے معاملے میں بہت سمجھ بوجھ اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر اس میں دور اندیشی کو جگہ نہ دی جائے تو یہ فرد کو موجودہ نظام حکومت کا محض آلۂ کار بنائے گی اور بس۔ اس لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم شہریت کے تنگ تصور کے خطرات سے آگاہ رہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہریت کی تعلیم کے دو مختلف مقصد ہو سکتے ہیں موجودہ نظام کو قائم رکھنا اور اسے تقویت پہنچانا یا اس کی جگہ دوسرے نظام کی داغ بیل ڈالنا' یا دوسرے لفظوں میں افراد کو ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لیے تیار کرنا جہاں تعلیم قدامت پسند ریاست کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں تقریباً ہمیشہ اس کا مقصد موجودہ نظام کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے اور اس صورت میں تعلیم ایک پیچھے لے جانے والی طاقت کا کام کرتی ہے۔ قدامت پسند ریاستیں شہریت کے نام سے جمہور میں جو باتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں ان میں سے اکثر اچھی نہیں ہوتیں۔ کسی شہری میں حب وطن کی خوبی کو بہت سراہا جاتا ہے۔ لیکن یہ حب وطن افراد میں جس شدت سے کے

ساتھ پیدا کی جاتی ہے وہ پسندیدہ ہونے کے بجائے بہت بُری چیز ہے۔ شہری اپنے وطن کے مقابلے میں دوسرے دیسوں کو گھٹیا سمجھنے لگتا ہے اور کسی حد تک انھیں حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا جو خوفناک نتیجہ ہو سکتا ہے اس کا ایک دل ہلا دینے والا سین آج ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ فاشسٹ نظام حکومت میں ایک اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور تہذیب کو سب سے اچھا سمجھے اور یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی سمجھے کہ دنیا کے کسی اور ملک کو اپنے تمدن اور تہذیب کو قائم رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسی لیے تمام دنیا والوں کو اسی کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔ اسی بات کا بیڑا جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے ہٹلر کی رہنمائی میں اٹھایا تھا کہ وہ گولے اور بارود کے زور سے تمام دنیا کو مہذب بنا کے چھوڑیں گے! ہندوستان کی قومی تحریک میں بھی اس رجحان کی ایک جھلک دکھائی دیتی تھی۔ قومی جھنڈے کے گیت میں تمام دنیا کو جیتنے کی امنگ کا اظہار ہوتا ہے "وشو وجے کرکے دکھلاوے، تب ہووے پرن پورن ہمارا" یعنی جب ہمارا ترنگا جھنڈا تمام دنیا پر لہرائے گا تب ہی ہمارا عہد پورا ہوگا۔ اس قسم کی شہریت کی تعلیم نہ صرف دوسرے ملکوں کو ظلم و استبداد کا شکار بنانے کی طرف مائل کرتی ہے بلکہ وہ اپنے ملک میں بھی تشدد اور ناانصافی برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کبھی کسی بڑے کارخانے یا تعلیمی ادارے میں ہڑتال ہوتی

ہے تو ہم میں سے اکثریت کی ہمدردیوں کا رُخ کس طرف ہوتا ہے۔ ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہیں جن کی ہمدردی صحیح معنوں میں مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یوں زبانی ہمدردی تو تقریباً سب ہی دکھاتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کی مدد کرنے والے بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں۔ آخر اس سنگ دلی اور بے حسی کی اصل وجہ کیا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری شہریت کی تعلیم ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ملک کا قانون اور دستور اس قسم کی سماجی نا انصافیوں کو جائز قرار دیتا ہے۔ دستور چاہتا ہے کہ ضبط اور امن بہر صورت قائم رہے کیونکہ اس کے بغیر اقتدار رکھنے والی جماعت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ معمولاً مدرسہ طلبہ کو بزدلی کا سبق دیتا ہے۔ وہ سکھاتا ہے کہ موجودہ سماجی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہے۔ بھلا ایسے مدرسوں کے طلبہ سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

اب تک ہم نے اس بات سے بحث کی ہے کہ موجودہ نظام کو تقویت پہنچانے والی شہریت کی تعلیم کس قسم کی ہوتی ہے اور اس میں کیا خرابیاں ہیں۔ اب ہم شہریت کی تعلیم کے دوسرے مقصد کو لیں گے۔ یعنی پرانے نظام کی جگہ ایک ایسا نظام قائم کرنا جس کا انحصار انصاف اور انسانی مساوات کے اصول پر ہو۔ یہ ان لوگوں کا نظریہ ہے جن پر موجودہ نظام کا سخت ردِ عمل ہوا ہے اور جنھیں انقلاب کے سوا نجات کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہاں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایک انقلابی کے نزدیک شہریت

کا تصور اسی قدر تنگ ہو سکتا ہے جس قدر کہ قانون اور دستور کے حامی کا۔ کسی قائم شدہ نظام سے بغاوت اور دشمنی کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں۔ مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی یا خوش حال لوگوں کے ساتھ نفرت۔ بعض انقلابیوں کی جدوجہد عوام کو خوش حال بنانے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں سے انتقام لینا مقصود ہوتا ہے جو موجودہ صورت حال کے ذمے دار ہیں۔ یہ اپنی جگہ کوئی پسندیدہ جذبہ نہیں ہے ایک منفی رجحان ہے۔ تنگ نظر اور متعصب انقلابی دنیا و زیست کو رفتہ رفتہ اختیار کر لیتا ہے جو حسن اور آہنگ کے سرچشموں کو ہر صورت میں اُبھرنے سے روکتی ہے۔ ہاں یہ بات تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ لازمی ہے کہ اگر ہمیں ایک چیز سے محبت ہے تو اس کی متضاد چیز سے نفرت ہوگی۔ لیکن ہم ان میں سے کس کو پہلے رکھیں اور کس پر زیادہ زور دیں، اس سے ہمارے عمل میں بہت بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ انقلاب کا حامی قانون اور دستور کے حامی کے مقابلے میں بہتر تعلیم دے سکتا ہے۔ قدامت پسندی میں اعلیٰ قسم کے ذہنی عمل کی گنجائش کم ہے۔ برعکس اس کے انقلاب کے حامی کو کسی حد تک ہر وقت تخیل سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ وہ موجودہ چیزوں سے بہتر کوئی دوسری چیز پیش کر سکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف ہو اور انھیں کسوٹی سمجھ کر موجودہ سماج کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ ان لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجودہ

نظام کے مظالم کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ یا وہ لوگوں کی تکلیف دور نہ کرنے کے بہانے تلاش نہیں کر سکتا۔ بہرحال قدامت پسند تعلیم کے مقابلے میں انقلاب پسند تعلیم میں عقل، آپج اور ہمدردی سبھی کے لیے زیادہ جگہ رہتی ہے۔

باوجود اس کے کہ شہریت کی تعلیم میں خطرے ہیں تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سماج کی کڑیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ مہذب زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں باہمی اشتراک عمل پر منحصر ہیں اور صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور بھی بڑھتی جائے گی۔ قومی مرکزیت کا احساس اب تقریباً سب ہی ملکوں میں زور پکڑ رہا ہے لیکن زمانۂ حال کی مسلسل جنگ کی ہولناک تباہیوں نے شدت کے ساتھ اب اس کا احساس پیدا کر دیا ہے کہ محض قومی مرکزیت سے بھی کام نہیں چلے گا۔ جب تک بین الاقوامی مرکزیت کو قائم نہ کیا جائے۔ اس کے بغیر ہماری سائنٹفک تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اس کو خودکشی کرنا پڑے گی۔ جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں اس لیے تمام ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیرپا امن قائم کرنے کی خاطر اقوام متحدہ کو مضبوط بنائیں۔

یہ تو ماننا پڑے گا کہ شروع میں کچھ عرصے تک اس قسم کی شہریت کی تعلیم میں بھی کچھ خرابیاں ضرور رہیں گی جو انفرادی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گی۔ لیکن اگر اس کے بغیر ساری دنیا کی تہذیب وتمدن کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ان

عارضی خرابیوں کو برداشت کرنا چاہیے۔ آج کل کی قومیں پرانی قوموں کے مقابلے میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتی ہیں اور اگر انھیں زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا ہے تو ان کے افراد میں قومی شہریت کے احساس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی شہریت کا احساس تیز سے تیز تر ہونا چاہیے۔ نوع انسانی سے وفاداری پیدا کی جائے تو وہ قومی وفاداری کے بدترین نتیجے یعنی جنگ کے امکانات کو کم کرنے میں مدد دے گی۔ اس لیے اب تعلیم کا سب سے بڑا کام افراد میں بین الاقوامی شہریت کا احساس پیدا کرنا اور بڑھانا ہے۔ اب ہمارا کام بحیثیت استاد کے یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کو دنیا کی اس ہونے والی ریاست کا شہری بنائیں یعنی ان میں وہ ذہنی اور عملی خوبیاں پیدا کریں جو اس ریاست کے قیام میں مدد دیں گی۔ ہم اپنے طلبہ میں یہ احساس بیدار کریں کہ تمام دنیا کے بسنے والے ایک ہی انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں، وہ تمام لوگ جو محنت اور ایمان داری سے روزی کماتے ہیں قابلِ عزت ہیں۔ ہمیں ان کی سیوا کرنی چاہیے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا چاہیے۔ ان میں ان کی موجودہ پستی اور تباہی کا احساس پیدا کرنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی تدابیر بتانی چاہییں۔ اس قسم کی تعلیم تمام دنیا کی ایک جمہوری ریاست قائم کرنے میں مدد دے گی۔ جبکہ ساری دنیا کے ممالک مساوات اور باہمی تعاون کی بنا پر

ایک مضبوط بین الاقوامی جماعت بنالیں گے۔ اس وقت انفرادی نشوونما کے لیے بھی صحیح معنوں میں مواقع مہیا ہوں گے۔ تب تعلیمی میدان میں سیاست اور بچے کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے نہیں۔ اس وقت جارحانہ قسم کی قومیت کی تعلیم دینا غیر ضروری ہوگا۔ پھر غلط تاریخ پڑھانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ پھر ہمارے تعلیمی اداروں میں بچوں کو یہ بتانے اور یقین دلانے کی کوئی وجہ نہ ہوگی کہ انگریزوں کی حکومت یا مسلمانوں کی سلطنت انصاف اور اخلاق کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی تھی۔ یا یہ کہ ہندو راج "رام راج" تھا جہاں گائے اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ ہندوؤں کا قدیم کلچر بہت ہی ترقی یافتہ تھا۔ یہاں تک کہ اس زمانے میں ہندوستانیوں نے وہ تمام چیزیں ایجاد کر لی تھیں جنھیں آج جدید سائنس کے کرشموں میں شمار کیا جاتا ہے وغیرہ۔ غرض اس وقت انسانی ذہن ہر قسم کے تعصبات و توہمات سے پاک ہو جائے گا۔

شہریت کی تعلیم کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اچھے شہری کس طرح تیار کیے جائیں۔ شہریت کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے۔ جب بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اس وقت ہی سے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ اس میں کچھ ایسی عادتیں پیدا کر دیتے ہیں جو شہریت کے لحاظ سے مفید یا مضر ہوتی ہیں۔ اگر گھر میں بچے کو بہت زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا ہے اور اس کی ہر ضد کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ بچے میں اپنی ضرورت اور خواہش کو مقدم سمجھنے کا رجحان ترقی کرتا ہے یعنی

طور پر شہریت کی تعلیم کی یہ بہت بڑی ابتدا ہے۔ ایسا بچہ بڑا ہونے پر بھی خود غرضی کی طرف مائل ہوگا اور اسے دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھانے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ برعکس اس کے اگر گھر میں بچے پر بہت بے جا دباؤ ڈالا گیا تو یہ بھی شہریت کی تعلیم کے حق میں بُرا ہے کیونکہ اس صورت میں اُس میں خود اعتمادی کے بجائے احساسِ کمتری پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کوئی کام ہی نہ کر سکے اور ہر معاملے میں دوسروں کا دست نگر رہے۔ لہٰذا شہریت کی تعلیم کے لیے وہی گھر اچھا ہے جہاں بچے کو شروع سے عملاً یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے جہاں اسے دوسرے بچوں کے ساتھ مل جُل کر کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے اور جہاں اسے ہر بات میں دوسروں کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ بہت کم گھر ایسے ہیں جو صحیح تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس لیے شہریت کی تعلیم کا فرض کلیتہً مدرسے کے ذمے آتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ گھر اس بڑے کام میں مدرسے کا ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اکثر گھر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اس صورت میں مدرسے کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کو بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے اس بڑے فرض کو انجام دینا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ مدرسے کی زندگی میں ایسے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کرے جن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر کام کرنا سیکھیں۔

اپنی نجی ضرورتوں کو باری باری سے پورا کریں۔ مدرسے کے سامان کو ذمے داری سے استعمال کریں۔ اس قسم کی سماجی خوبیاں بچوں کو چھوٹی چھوٹی ذمے داریاں دینے سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مدرسے اور جماعت کا انتظام کرنے کے لیے بچوں کی خود اختیاری حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو انھیں سماج سیوا کے بڑے کام سونپے جا سکتے ہیں۔ مثلاً دیہات سدھار، تعلیم بالغان، فرسٹ ایڈ، میلوں اور حادثوں میں عوام کی امداد کرنا وغیرہ۔ ان میں سے بعض کام گرمیوں کی بڑی تعطیلات میں منظم طور پر کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے طلبہ میں ان کاموں کے ذریعے یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ دنیا کے کام مل جُل کر کرنے سے بخوبی چلائے جا سکتے ہیں۔ وہ اس بات کی اہمیت سمجھ جائیں گے کہ جو چیزیں عوام کے استعمال کے لیے ہیں انھیں بہت سلیقے اور ذمے داری سے برتنا چاہیے۔ اور کسی چیز پر اپنے حق کی خاطر دوسروں کے حقوق نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

اگر ہم اپنے موجودہ تعلیمی ادارے کو اس کسوٹی سے جانچیں تو ہمیں بڑی مایوسی اور ندامت ہوتی ہے۔ اچھے شہری ہماری موجودہ تعلیمی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ اسے آپ تعلیمی فضا کہیں گے یا تخریبی فضا جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں۔ اٹھتی ہوئی امنگوں اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو کچلنے والا فوجی ضبط، ذہنیت پست کرنے والی اور اخلاق بگاڑنے والی تعلیمی روایتیں۔ بلا سمجھے بوجھے رٹنے کے لیے کتابوں کا ایک ڈھیر اور سب سے بڑا امتحان کا ہوّا جو مہینوں

رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ اچھے شہری پیدا کرنے کے لیے تعلیمی فضا کو ان برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ ہمارے نئے مدرسے میں جُرمانے یا مدرسے سے اخراج کا خوف دلا کر ضبط پیدا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی بنیاد طلبہ اور اساتذہ کے باہمی خوشگوار تعلقات پر قائم کی جائے گی۔ وہاں افراد ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں گے۔ وہاں دفعدار کے ملازموں کی طرح طلبہ کی نگرانی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ خود اپنے نگراں ہوں گے۔ وہاں جاسوسی سب سے بڑا اخلاقی گناہ سمجھا جائے گا۔ طلبہ خود اپنی بنائی ہوئی انجمنوں اور اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعے ضبط قائم رکھیں گے۔ مدرسے کا ہر رکن انجمن کے سامنے اپنے کردار کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر فرد ضبطِ نفس کا عملی سبق سیکھے گا۔ پھر وہ نہ صرف اپنے مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بھلے مانس کی طرح رہے گا بلکہ باہر بھی۔ پھر وہ تکلیف دہ اور شرمناک نظارہ جس سے ہمیں سینما اور ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر یا ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں آئے دن دوچار ہونا پڑتا ہے، جہاں انسانوں کا مجمع برتاؤ کے اعتبار سے مویشیوں کے گلّے سے مشابہ نظر آتا ہے، کبھی دکھائی نہ دے گا۔

اگر بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی ادارے یہ کام نہ کرنا چاہیں شاید ان کے منتظمین آج کے فرسودہ سماج کو قائم رکھنے کے لیے تعلیمی اصول اور طریقے نہ بدلیں تو پھر ہمارا فرض کیا ہے؟ اگر ہم ان شہری خوبیوں کی قدر کرتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے

تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم انھیں خود اپنی شخصیت میں سمولیں۔ اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم ان خوبیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں فرصت کے اوقات میں آرام چھوڑ کر عوام تک پہنچنا ہوگا۔ ان کے ساتھ مل کر ان کے دُکھ درد میں شریک ہوکر ان کے دلوں میں گھر کرنا ہوگا۔ ان کے لیے کلب، رات کے مدرسے، کتب خانے، پڑھائی گھر وغیرہ قائم کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے سرمایے سے زیادہ جوش اور نیک نیتی سے کام کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بعض ممالک کے طلبہ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ کیا ہندوستان کے طلبہ جو آج ایک منظم نیا ہندوستان بنانے کے آرزومند ہیں ادھر دھیان دیں گے اور اس میدان میں اپنے قدم بڑھائیں گے ؟ میرے نزدیک ان کے شہری اور سماجی احساس کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑی اور صحیح کسوٹی یہی ہے۔ کیا طلبہ اس امتحان کے لیے تیار ہیں ؟

۹۔ تعلیم اور مسئلہ معاش

آج کل مختلف پلیٹ فارموں سے یہ آواز بلند کی جارہی ہے کہ موجودہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ یونیورسٹیوں کے کنووکیشن اڈریس، کالجوں اور اسکولوں کے سالانہ جلسوں کی رپورٹیں ہی نہیں بلکہ خالص سیاسی انجمنوں کے سالانہ جلسوں کی روداد یں بھی اس بات کو پُر زور طریقے سے پیش کرتی ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم بالکل ناکارہ اور نکمے افراد پیدا کرتا ہے۔ اس بدحالی کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہماری تعلیم محض نظری ہے، جسے تعلیمی اصطلاح میں لبرل تعلیم کہا جاتا ہے اور اسے مسئلہ معاش سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ صرف ایسے اشخاص پیدا کرتی ہے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کوئی عملی کام نہیں کرسکتے اور بے روزگار اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے یہ کہنا کچھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نام نہاد لبرل تعلیم تنگ معنوں میں محض معاشی تعلیم ہے کیونکہ تعلیم پانے کے بعد ہر شخص ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے

کہ یہ تعلیم ملازمت کے علاوہ اور کسی کام کے کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ ہر تعلیم یافتہ کو ملازمت نہیں ملتی کیونکہ ملازمتوں کا میدان محدود ہے اور امیدواروں کی تعداد دن بدن بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ بے روزگار رہتے ہیں اور بڑی مصیبت میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

اس کا ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ اب کچھ لوگ بڑی شدت سے یہ تجویز پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ بچوں کو صرف وہ تعلیم دینی چاہیے جو انھیں بعد ازاں براہِ راست روزی کمانے میں مدد دے۔ نظری اور کتابی تعلیم کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ صنعت و حرفت کے مدرسے قائم کیے جائیں اور اُن میں لکھنا پڑھنا اور حساب محض اس قدر سکھایا جائے جتنا کہ اُس کام کے کرنے اور سیکھنے کے لیے ضروری ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ تجویز تنگ نظری پر مبنی ہے۔ تعلیم کے مقصد کو روٹی کمانے تک محدود کر دینا اعلیٰ تعلیم کے مقصد کو گرانا ہے۔ روزی یا پیشے کے لیے تیاری بحیثیت تعلیمی مقصد کے بہت ناقص نظریہ ہے۔ اس کے کئی ایک سبب ہیں اولاً جمہوری حکومت میں کسی بچے کو پہلے ہی سے کسی خاص پیشے کے لیے تیار کرنا نہ صرف اس بچے کے حق میں بڑی ناانصافی ہے بلکہ اُس سے قومی کارکردگی کو بھی بہت بڑا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایسا نظامِ تعلیم کبھی موجد، محقق یا نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں کر سکتا۔ کوئی کام

جو میکانکی طریقے سے کیا جاتا ہے، کرنے والے کی شخصیت کے ابھار اور اُبھارنے کے لیے نہ صرف ناموزوں ہے بلکہ مضر ہے۔ لہٰذا یہ طریقۂ کار انفرادی اور سماجی دونوں اعتبار سے خراب ہے۔ دوم یہ ضرب المثل ہے کہ بچہ صرف زمانہ حال میں رہتا ہے۔ اُس کی تمام تر دلچسپیاں "حال" سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اُس کے نزدیک "مستقبل" محض مستقبل کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اُس کے سر کوئی ایسا کام منڈھ دینا جس کا تعلق صرف مستقبل سے ہے بڑا ظلم ہے۔ چاہیے یہ کہ بچے کی موجودہ ضرورتوں کے مطابق اُسے تعلیم دی جائے۔ اگر آپ حال کا خیال رکھیں تو مستقبل خود بخود اپنا خیال رکھے گا، اس لیے وسیع معنوں میں یہ تعلیم بھی آیندہ آنے والی زندگی کے لیے تیار کرتی ہے۔ سوم یہ کہ انسان محض کھانے کے لیے زندہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی قائم رکھنے کے لیے کھاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد بہت اعلیٰ ہے دنیا کی موجودہ تہذیب اور تمدن سب اُس کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جسے قائم رکھنا اور ترقی دینا اس کا عین فرض ہے۔ لہٰذا تعلیم کے مقصد کو روزی کمانے تک محدود کر دینا انسانیت کے حق میں بڑا گناہ ہے۔

اب جمہوری خیالات کے پرچار کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ان دونوں راستوں کے بیچ بیچ ایک تیسرا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی یہ کہ تعلیم کے لبرل اور معاشی مقاصد میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس سے ایک نہایت مضحکہ خیز نظام تعلیم عالم وجود میں آگیا ہے، جس میں دونوں قسم کے مضامین۔

کلچرل اور افادی ایک اٹل جوڑ کی شکل میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ ان میں نہ تو اول الذکر قوت تخیل اور عقل کے سوتے جاری کرتے ہیں اور نہ موخر الذکر سماجی اعتبار سے کارآمد ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ مثال کافی ہوگی ــــ زبان اور علم ادب کو نصاب تعلیم میں کلچرل نقطۂ نظر سے داخل کیا گیا ہے لیکن ان سے کلچرل مقصد حل نہیں ہوتا۔ ان وہ افادیت کے نقطۂ نظر سے البتہ کسی حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں یعنی یہ کہ زبان سیکھ کر ہم آپس میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور بس۔ اس کا کلچرل پہلو عمل میں قریب قریب نظر انداز سا کر دیا گیا ہے۔ سائنس کی تعلیم افادی مقصد سے شروع کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس کے ذریعے تجربات کرنے کی عادت پڑے گی اور اس کی معلومات سے ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں عملی فائدہ اٹھائیں گے کیونکہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ اب سائنس کی دنیا بن گئی ہے۔ لیکن نتائج اس بات کے شاہد ہیں کہ سائنس کی تعلیم سے یہ مقصد بالکل پورا نہیں ہوا۔ کسی سائنس کے گریجویٹ کو لے لیجیے وہ ضرورت پڑنے پر اپنے کمرے میں فیوز وائر نہیں لگا سکتا، گھر کے پنکھے کے معمولی نقص کو خود درست نہیں کر سکتا، اپنے ہیٹر کی ذرا سی خرابی کو خود ٹھیک نہیں کر سکتا وغیرہ، اگرچہ وہ بجلی کی حرکت کے متعلق جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں سب سے بخوبی واقف ہے اور ضرورت پڑنے پر بجلی کے کسی موضوع پر ایک اچھی خاصی تقریر کر سکتا ہے لیکن اس سے متعلق معمولی عملی کام خود انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے وہ بجلی کے عملی ماہر کا ہمیشہ

دست نگر رہتا ہے۔ پس سائنس کی تعلیم سے کوئی عملی فائدہ مشکل سے ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ہوتا ہے تو تنگ معنوں میں اسے کلچرل کہا جا سکتا ہے کہ چند معلومات زیور کی طرح ذہنی زندگی کو زینت دیتے رہتے ہیں۔ اس بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہمارے مقصد اور حاصل میں بیّن تضاد ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے — اور وہ بڑی اہم ہے — کہ مختلف مضامین میں اس قسم کی تفریق اور امتیاز مصنوعی ہے۔ جس طرح انسان کی زندگی ایک منظم وحدت ہے اسی طرح تمام انسانی معلومات ایک مربوط کل ہے۔ لہٰذا مختلف مضامین کے ساتھ مختلف خصوصیات منسوب کرنا سخت غلطی ہے۔ ہر مضمون میں کم و بیش دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ افادی اور کلچرل۔ جن میں سے کسی ایک کو کلیتہً نظر انداز کر دینا "وحدت" کے منتشر کر دینے کے مرادف ہے۔

مضامین کے اس باہمی فرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے تاریخی پس منظر کو دیکھنا چاہیے۔

یہ بیّن تضاد جو خالص نظری اور عملی مضامین میں پایا جاتا ہے اُس سماجی حالت کی پیداوار ہے جو قدیم یونان میں تھی۔ یہ دور غلامی تھا جس میں اہل یونان محکوم غلاموں کی محنت مشقت سے فائدہ اٹھاتے اور خود "پرورشِ لوح و قلم" میں مصروف رہتے تھے۔ یونان کے مختلف شہروں میں رسم و رواج اور روایات جداگانہ تھے — اگرچہ یہ رسم و رواج تجربے کی بنا پر قائم ہوئے تھے، لیکن ان کو معیار سمجھ کر افراد اور جماعتوں کے کردار جانچے جاتے تھے۔ اس

بے اصولی اور من مانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور سمجھ دار لوگ اس ضرورت کو محسوس کرنے لگے کہ کوئی ایسا خارجی معیار قائم کیا جائے جو ہر چیز کی قدر کو صحیح طور سے معلوم کر سکے۔ ایتھنس کے فلسفیوں نے ان معیاروں پر شدت سے نکتہ چینی کی۔ انھوں نے آخر یہ بات طے کی کہ صرف عقل ہی تمام عقائد اور کاموں میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ لہٰذا عقل کو تجربے پر فوقیت دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی مضامین کو عملی مضامین پر ترجیح دی جانے لگی۔ ہر وہ کام جو ہاتھ سے کیا جاتا ہے ذلیل اور ہیچ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صنائع —— موسیقی، مصوری، علم طب وغیرہ —— کو بھی نظری علوم، فلسفہ، منطق، ریاضی وغیرہ سے کم گردانا جانے لگا، محض اس وجہ سے کہ اول الذکر علوم عملی ہونے کی وجہ سے جسمانی اعضا کے استعمال سے متعلق ہیں اگرچہ ان میں بھی معمولی عقل سے کام نہیں چل سکتا۔ افلاطون کا یہ قول کہ "فلسفی کو بادشاہ ہونا چاہیے" یعنی امور حکومت فلسفی کے ذمے ہونے چاہییں۔ صاف طور سے اس رجحان کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن نئی تعلیم کے بہتر طریقوں نے ثابت کر دیا ہے کہ نظری اور عملی مشاغل ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے بجائے معاون ہیں یعنی یہ کہ عملی کام کے ذریعے نظری مضامین کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور عملی کام میں عقلی طریقے استعمال کر کے اس کے حسن اور زینت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے

"کوئی کام، فن یا مضمون میکانکی کہلانے کا مستحق ہے، اگر وہ آزاد انسان کے جسم، روح یا عقل کو اپنے کام میں حُسن پیدا کرنے میں مانع ہے"۔ اس لیے ہر عملی کام کی سائنٹیفک بنیاد کا جاننا اور اس کے کرنے کے عقلی طریقے سے واقف ہونا از حد ضروری ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے مختلف مضامین کے مقاصد میں بُعد اور فرق سماجی حالات کا رہین منت ہے۔ اگر روزی کمانے، اور فرصت کے اوقات کو مہذبانہ انداز میں استعمال کرنے کے مواقع سماج کے مختلف افراد میں برابر برابر تقسیم ہوتے تو یہ بات کسی کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ تعلیمی وسائل اور مقاصد کے درمیان کوئی تصادم یا کش مکش ہوسکتی ہے۔ اگر ایک مزدور اور حکومت کے ایک رُکن کے درمیان ریاست کی طرف سے، جہاں تک کہ اُن کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے، کوئی امتیاز نہ ہو، تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مزدور کے کام کو ذلیل اور حاکم کے عہدے کو باعظمت سمجھا جائے کیونکہ اس قسم کے نظامِ حکومت میں ہر فرد کے کام کی اہمیت ہے۔ یہاں ریاست ایک انجن کے مانند ہے جس کے تمام پُرزے، چھوٹے اور بڑے۔ ایک دوسرے کے اشتراکِ عمل سے چلتے ہیں۔ اگر چھوٹا پُرزہ اپنا کام ٹھیک طرح سے کرنا بند کردے تو بڑا پُرزہ بھی بیکار ہوجائے گا اور انجن کی زندگی ختم ہوجائے گی۔

تعلیم کی کسی جمہوری اسکیم میں وہ مواد جو تعلیم کے ایک پہلو

کو اُجاگر کرتا ہے، اُسے بالواسطہ دوسرے پہلو کو بھی دینا چاہیے۔
توقع کی جاتی ہے کہ موجودہ مشینی دور میں مزدور کے پاس بھی فرصت کا کافی وقت ہوگا کیونکہ مزدور جو کام کئی دن میں کرتا وہ مشین چند گھنٹوں میں کر دے گی۔ لہٰذا فرصت کے اس وقت کے صحیح استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے تاکہ سماجی کارکردگی کو نقصان نہ پہنچے۔ اس لیے ہمیں اپنے افراد کو نہ صرف کام کرنے کے موثر طریقے بتانے ہیں بلکہ فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال بھی سکھانا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کے دونوں پہلوؤں۔ کلچرل اور افادی پر برابر توجہ دی جائے۔ بعض ممالک میں اس سلسلے میں عملی جدوجہد کی گئی ہے اور اس کے نتائج بہت ہمت افزا ثابت ہوئے ہیں۔ روس میں جہاں اس قسم کی کوشش بڑے پیمانے پر کی گئی ہے، ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ایک معمولی مزدور کچھ عرصے بعد ایک قابل انجینئر، یا یونیورسٹی کا پروفیسر بن گیا۔

ہاں تو اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم میں معاشی مسئلے کا کیا حل ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے اس کا حل موجودہ معاشرے کے مطالعے کے بغیر سوچنا بے معنی ہے۔ اب ذہنی اور سماجی حالات میں بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ اب ہر صنعت اور پیشے کی وہ چیزیں جو محض میکانکی حیثیت رکھتی ہیں دوسرے درجے کی تصور کی جاتی ہیں۔ اب ہر کام سائنٹیفک طریقوں کے ماتحت انجام دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح وقت اور طاقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے کہ صنعت کے عقلی

امکانات میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے کے باوجود صنعتی حالات اس قدر مایوس کن ہیں کہ عوام کے لیے صنعت میں بہ مقابلہ قدیم زمانے کے تعلیمی امکانات بہت کم رہ گئے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب کہ ہاتھ سے کام ہوتا تھا کاریگر اور عوام دستکاری کی ماہیت سے واقف ہوتے تھے، اُن کی بنائی ہوئی چیزوں میں ان کی اپنی شخصیت کا رنگ روپ موجود ہوتا تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ صنعتوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جہاں تمام کام مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جس شخص کے ذمے مشین چلانے کا کام ہوتا ہے اُسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ مشین کیونکر چلتی ہے وہ محض اتنا جانتا ہے کہ فلاں بٹن کے دبانے یا فلاں پرزے کو حرکت دینے سے مشین چلنے لگتی ہے اور بس۔ گویا کہ وہ خود بھی مشین کے ایک پرزے کی طرح کام کرتا ہے۔ اس صورت میں بھلا اُس کی شخصیت کا مظاہرہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کام کے ذریعے وہ فقط اپنی روزی کماتا ہے، کامیاب زندگی بسر نہیں کرتا۔ اُس کے کام میں اس کی شخصیت کی جھلک نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کی نشوونما کے لیے اس کا کام محض بیکار ہے۔

اب ذرا تعلیم کی طرف آئیے۔ قدیم زمانے میں بچہ اپنے گھر اور باہر کی زندگی سے متعلق تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے گھر میں روشنی کیونکر ہوتی ہے؟ چراغ کس چیز سے بنتا ہے؟ اُسے کون بناتا ہے؟ اس میں کیا جلتا ہے؟ تیل کہاں سے آتا ہے؟ کیسے بنتا ہے وغیرہ۔ موجودہ زمانے کا

نام نہاد متمدن بچہ جو بجلی کی روشنی میں پڑھتا ہے، اُس کے متعلق صرف اس قدر جانتا ہے — اور لوگوں کا خیال ہے کہ اتنا جاننا کافی ہے! — کہ وہ بٹن دباتا ہے اور لیمپ روشن ہو جاتا ہے — اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے زمانۂ قدیم کا بچہ موجودہ زمانے کے بچے سے کہیں زیادہ سمجھ بوجھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔

اس صورتِ حال میں مدرسے کا فرض ہے کہ "وہ مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرائے اور تمام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لیے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کرکے انھیں اُن کی نظر میں معنی خیز بنائے۔ انھیں اُن کی عظمت سے روشناس کرائے۔" اُن کے دل میں موچی کی وقعت اس لیے ہونی چاہیے کہ اگر وہ اپنا کام انجام نہ دے تو بڑے سے بڑا آدمی ننگے پیر چلنے پر مجبور ہوگا۔ بچوں میں یہ بات بھی پیدا کرنی چاہیے کہ "وہ پیشے کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں" اور محض مشین بن کر نہ رہ جائیں۔

اس مختصر مقالے سے یہ بات واضح ہے کہ تعلیم کے معاشی اور برل مقاصد میں کوئی لازمی ٹکراؤ نہیں ہے۔ مدرسے میں معاشرے کے تمام پہلوؤں کی نمایندگی ہونی چاہیے۔ لیکن اُسے کارخانے یا صنعتی مدرسے میں تبدیل کر دینا بڑی غلطی ہوگی۔ یہاں کسی مخصوص پیشے کی تعلیم کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پیشہ ورانہ

تعلیم و تربیت کے لیے الگ ادارے ہونے چاہییں۔

ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل کی غرض بچوں کی آرزوئے تخلیق اور خواہش عمل کی تشفی ہونی چاہیے۔ ہندوستان میں "بنیادی تعلیم" کا اجرا بھی اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اس میں بنیادی حرفہ کی نہ صرف یہ اہمیت ہے کہ وہ بچوں میں جسمانی یا دستی کام کی عظمت پیدا کرے گا بلکہ وہ سیکھنے کا ایک دلچسپ اور عملی طریقہ بھی پیش کرتا ہے۔ حرفہ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم بچوں کو کاریگر یا مزدور بنانا چاہتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے بچے کی شخصیت کی ہم آہنگ نشو و نما مقصود ہے۔ لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہم کسی لڑکے کو جلاہا، بڑھئی یا مالی بنانا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسے کے سیکھے ہوئے حرفوں میں سے کسی ایک کو اپنی زندگی کا مشغلہ قرار دے لے اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں ہے۔

ثانوی مدرسوں میں مختلف پیشوں کی عام تعلیم ہونی چاہیے جس کی غرض بچوں کو اظہار ذات کا موقع دینا ہو نہ کہ کسی مخصوص پیشے کے لیے تیاری۔ اس طرح سے وہ معاشی نظام سے واقف ہو جائیں گے نیز ہمارے سماج میں جو "محنت" اور "فرصت" کی دوعملی ہے وہ بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔

ثانوی تعلیم کے آخری دو ایک سال کسی ایک پیشے میں خاص تعلیم کے لیے وقف کیے جا سکتے ہیں۔ پیشہ بچے کے طبعی رجحانات اور صلاحیتوں کے مطابق منتخب کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں "معاشی

جانچ "جس کی بنیاد سائنٹیفک اصول پر ہے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کام بہت اہم بھی ہے' اس لیے کہ موجودہ زمانے میں شاید انسان کو غربت و افلاس سے اس قدر تکلیف نہیں پہنچتی ہے جس قدر اس بات سے کہ بہت سے لوگ مجبوراً وہ پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں اُن کے لیے کوئی اپیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ اُن سے پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ملتی ہے۔

۱۰۔ جمالیاتی تعلیم

استاد یا والدین کی حیثیت سے ہم سب کا تعلق بچوں کی تربیت سے ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ بچے زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ہوں۔ اس غرض سے ہم ان کو وہ سب باتیں سکھانا چاہتے ہیں جو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ہم ان کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنی ترقی کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہیں اور ان کے اخلاق اور چال چلن کو سنوارنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ ہم بچوں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت کا تو کسی حد تک خیال رکھتے ہیں، لیکن ان کے جمالیاتی احساس کی نشو و نما کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ نہ تو ان کو خوبصورت چیزیں بنانے کی طرف مائل کرتے ہیں اور نہ ہی اُن میں حُسن کو سراہنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کی زندگی کا جمالیاتی پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی محدود معنوں میں کامیاب ہو۔ وہ بڑے تاجر، بینکر، انجینیر، عالم یا سرکاری افسر ہو جائیں اور لوگوں میں ان کی

عزت بھی ہو۔ لیکن ان کی زندگی میں حسن اور خوبصورتی کی کمی رہتی ہے۔ اس لیے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم نے اپنے بچوں کو پورا انسان بنانے کی کوشش کی ہے۔

دراصل جمالیاتی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچے کی تخلیقی قوتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ اس کی زندگی حسن کی دولت سے مالا مال ہو سکے اور وہ اپنے دامن کو دائمی خوشی کے پھولوں سے بھر سکے۔ ان قوتوں کے سوتے اپنے نکاس کے لیے راستے ڈھونڈتے رہتے ہیں اور موقع ملنے پر مختلف شکلوں میں پھوٹ نکلتے ہیں۔ بچہ گیلی مٹی سے کھیلتا ہے۔ وہ اس سے طرح طرح کی چیزیں بناتا ہے۔ ہم اُسے ڈانٹتے ہیں کہ "مٹی سے مت کھیلو اس سے جسم اور کپڑے میلے ہو جائیں گے۔" ہمیں نہیں معلوم کہ اس طرح ہم بچے کو معصوم خوشی حاصل کرنے کے ایک بڑے ذریعے سے محروم کر رہے ہیں۔ مٹی کا کھلونا بچے کے نزدیک اس کا ایک بڑا شاہکار ہے۔ اس میں وہ اپنی شخصیت کا رنگ روپ بھرتا ہے۔ وہ اس کے لیے اظہار ذات کا ایک ذریعہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اسے اس نظر سے پرکھتے اور داد دیتے! اسی طرح اس بچے کو دیکھئے جو کھریا یا کوئلے سے فرش پر بظاہر ایک بھدی، بے ڈول اور بے معنی شکل کھینچ رہا ہے۔ اس کام میں کتنی لگن ہے اور وہ کتنا مگن ہے۔ وہ اس میں کھو سا گیا ہے! لیکن افسوس کہ اس کا یہ کام ہمارے نزدیک محض اس کے پھوہڑپن اور بدتمیزی کا ثبوت ہے۔ ہم اس پر برس پڑتے ہیں۔ اس کی ہمت ٹوٹ جاتی

ہے اور اظہارِ ذات کے اس دلچسپ مشغلے سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔ شاید ہم نے اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ایک ہونہار مصوّر کا خون کر دیا ہے۔ اب اس بچّے کو لیجیے جو سرمئی بادل کے ٹکڑوں کو اِدھر اُدھر بھاگتا دیکھ کر ان کے پیچھے اپنی نظر دوڑاتا ہے اور اس نظارے میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہتی اور اس کے احساسات کا سیلاب بے اختیارانہ راگ کی شکل میں بہنے لگتا ہے۔ یا جب وہ برسات کے دنوں میں آسمان پر رنگین دھنک دیکھتا ہے، تو خوشی کے مارے اس کا چہرہ کلی کی طرح کھل اٹھتا ہے اور وہ اسے اس وقت تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے، جب تک کہ وہ غائب نہیں ہوجاتی۔ کیا عجب ہے کہ اس بچّے میں ایک شاعر یا مصوّر کی روح موجود ہو! لیکن ہم اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اسے جھڑکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّے کی جمالیاتی صلاحیتیں اجاگر نہیں ہونے پاتیں اور رفتہ رفتہ وہ بچّہ جسے حُسن سے فطری لگاؤ ہے، بزدل ہوجاتا ہے اور اس کی تخلیقی قوتیں مردہ ہوجاتی ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھیے کہ ہر بچّہ مائکل انجیلو، ٹیگور، تانسین، ورڈس ورتھ یا غالب ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی غیرمعمولی صلاحیتیں بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اظہار ذات کے لیے ہر بچّہ فطری طور پر ان ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب آرٹ کی مختلف شکلیں ہیں۔ واقعی آرٹ اظہارِ ذات کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

کبھی کبھی زبان، دل کی باتوں کو اتنی اچھی طرح ادا نہیں کر سکتی جس خوبی اور کامیابی سے ان کو آرٹ کے ذریعے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ بچے کے فطری رجحانات پر آرٹ کی تعلیم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس تعلیم کے ذریعے ہم ہر بچے کو آرٹ میں ماہر نہیں بنا سکتے۔ لیکن اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ آرٹ کی چیزوں کو پرکھ سکے۔ حسن اور بدنمائی میں امتیاز کر سکے۔ اور ان سے صحیح انداز میں متاثر ہو سکے۔ آرٹ کی تعلیم کا یہی مقصد ہے۔

آرٹ کی تعلیم نہ صرف بچے کے لیے انفرادی طور پر ضروری ہے، بلکہ یہ قومی نقطۂ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ آرٹ کا قومی تمدن سے گہرا تعلق ہے۔ کسی قوم کا تمدن یا کلچر کس پائے کا ہے، اور اس کی زندگی میں خوش مذاقی اور رنگینی کس درجہ موجود ہے۔ اس کا اندازہ اس قوم کے آرٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے آرٹ کے معاملے میں ہماری موجودہ پس ماندگی سے ہمارے قومی تمدن پر بھی حرف آتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے گھروں اور مدرسوں میں آرٹ کی تعلیم کا مناسب انتظام کریں۔ یہ تعلیم بچوں میں حسن کا احساس اور اسے پرکھنے اور سراہنے کی قابلیت پیدا کرے گی اور اس طرح ہماری آنے والی نسل اپنی خوش مذاقی سے ہمارے قومی تمدن میں چار چاند لگائے گی۔ وہ اپنے آرٹسٹ کو گمنام اور بددل رکھ کر قومی آرٹ کا گلا نہیں گھونٹے گی، بلکہ ان کے کام کی قدر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرے گی، تاکہ وہ

ہمارے قومی سرمایے میں اپنے شاہکاروں سے اور بھی اضافہ کر سکیں۔

آیئے، اب ذرا اس مسئلے پر غور کریں کہ سچا آرٹ ہے کیا۔ زیادہ تر لوگ اس آرٹ کو پسند کرتے ہیں جو حقیقت سے قریب ہو۔ تصویر کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اصل کی ہو بہو نقل ہو۔ لیکن سچے آرٹ کو پرکھنے کی یہ کسوٹی بہت ناقص ہے۔ اگر اسے صحیح سمجھ لیا جائے، تو پھر فوٹو گرافی سے بڑھ کر کوئی دوسرا آرٹ نہیں ہو سکتا۔ مصور کسی تصویر کے بنانے میں اس کی امتیازی خصوصیات کا ضرور خیال رکھتا ہے، لیکن یہ لازمی نہیں ہے کہ اس کی تفصیلات بھی ظاہر کرے اور اسے اصل کے مطابق بنائے۔ بعض اوقات تصویر اور اصل چیز میں بہت فرق ہوتا ہے اور اس فرق کے باوجود وہ تصویر آرٹ کا ایک اعلیٰ شاہکار ہو سکتی ہے۔ اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ آرٹسٹ نے تصویر میں کیا معنی پیدا کیے ہیں۔ تصویر کے مجموعی اثر کو دیکھیے کہ وہ کس قسم کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس لحاظ سے ابتدائی انسان کا آرٹ جس کے نمونے مختلف جگہوں پر ملتے ہیں، سچا آرٹ ہے، گو کہ اس کے نمونے بظاہر بے ڈھنگے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بہت سی وہ تصویریں جو آج کل بازار میں بڑھیا چمک دار کاغذ پر چھپی ہوئی ملتی ہیں، گھٹیا درجے کے آرٹ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگرچہ عوام کے لیے وہ بہت دل کش اور جاذب نظر ہیں۔ "سچا آرٹ دل میں بلندی اور وسعت پیدا کرتا ہے اس کے خلاف بھدی مصوری دل میں پستی

پیدا کرتی ہے اور روح میں افسردگی اور مایوسی کا بیج بوتی ہے۔"
آرٹ انسان کی تخیلی زندگی کی سب سے اونچی منزل ہے۔ اس میں اس کی پوشیدہ قوتوں کا آزادانہ طور پر اظہار ہوتا ہے۔ آرٹ انسان کی بلند ترین تمناؤں اور آرزوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ عام آدمی چیزوں کے باہری رنگ روپ کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے، گویا کہ وہ محض چیزوں کے اوپر لگے ہوئے لیبل پڑھتا ہے۔ ان چیزوں کی حقیقت معلوم کرنا اس کے بس کی بات نہیں لیکن مصور کا منصب یہ نہیں ہے۔ وہ جب تک کسی چیز کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتا، اس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آرٹ کی چیز کو سطحی طور پر نہیں بلکہ اسے آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آرٹ کی اس مختصر سی تعریف کے بعد اب ہم ان وسائل کی جانچ پڑتال کریں گے، جن سے بچوں میں آرٹ کا صحیح مذاق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیزوں کی طرح بچے کے احساسِ حسن کی نشو و نما بھی گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ہر ایک گھر میں، کم از کم متوسط گھرانے میں، سجاوٹ کا کچھ نہ کچھ سامان تو ضرور ہوگا۔ کچھ فوٹو اور تصویریں ہوں گی اور کچھ گلدان اور گملے۔ کچھ پردے ہوں گے اور کچھ فرنیچر۔ ان کے انتخاب اور ترتیب میں مذاق کا دخل ہے۔ اگر یہ چیزیں خوش رنگ اور خوش وضع ہیں اور انھیں اچھے انداز میں ترتیب دیا گیا ہے تو بچوں کے ذوق پر اچھا اثر پڑے گا۔ رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر حسن کی قدر ان کے دل

میں پیدا ہو جائے گی لیکن بدقسمتی سے ایسی خوش مذاقی بہت کم گھروں میں دکھائی دیتی ہے۔ غریبوں کا تو کہنا ہی کیا، متوسط درجے اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں جمالیاتی ذوق کی بڑی کمی ہے۔ پڑھے لکھے اور دولت مند گھرانوں کو لیجیے۔ ان کے لباس اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کو دیکھیے کہ ان کے رنگ کیسے بھدّے اور بے میل نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت میں جمالیاتی پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور دوسرے انھیں قدرت کے حسن کو مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ہم قدرت کی چیزوں کو غور سے دیکھیں تو رنگوں کے انتخاب میں زیادہ خوش مذاقی سے کام لے سکتے ہیں۔ پھولوں، کیڑوں، تتلیوں وغیرہ کے رنگوں کو ذرا دھیان سے دیکھیے کہ ان میں کس قدر میل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ قدرت کے مشاہدے کی کمی سے لوگوں کا مذاق گھٹیا ہو گیا ہے۔ ان کے دل اس قدر بے حس اور سخت ہو گئے ہیں کہ ہلکے اور ہم آہنگ رنگ انھیں بھاتے ہی نہیں۔ وہ صرف تیز اور چمکیلے بھڑکیلے رنگ پسند کرتے ہیں۔

رنگ کے علاوہ لوگوں کی روزمرہ کام آنے والی چیزوں کی صورت شکل، قطع وضع میں بھی اچھا ذوق دکھائی نہیں دیتا۔ فرنیچر، گلدان، گملے، برتن وغیرہ اکثر بے ڈول ہوتے ہیں۔ بعض روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض سجاوٹ کے لیے ہیں نہ کہ استعمال کے لیے۔ بعض

گھروں میں عجیب عجیب شکلوں کے برتن، پلیٹیں، پیالے وغیرہ ہوتے
ہیں جو دیکھنے میں تو بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ان
کے اندر کوئی چیز رکھنی یا باہر نکالنی ہو تو بہت دشواری ہوتی ہے
اسی طرح بعض گھروں میں ایسے گلدان ہوتے ہیں جن میں جسامت
کے اعتبار سے بہت سے پھول رکھے جانے چاہییں لیکن ان کے
پیندے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں دو چار سے زیادہ
پھول رکھ دیئے جائیں تو وہ فوراً لڑھک جاتے ہیں یا ان کی
گردن اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ اس میں مشکل سے دو ایک پھول
ہی کے ڈنٹھل سما سکتے ہیں۔ یہ مثالیں اچھے ذوق کو ظاہر نہیں
کرتیں۔ چیزوں کے انتخاب میں خوبصورتی اور استعمال دونوں
باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ نہیں تو ڈر ہے کہ بچوں کے ذہن
میں حسن کا غلط تصور قائم ہو جائے گا۔ ہم اپنے حسن انتخاب سے
بچوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر سکتے ہیں کہ کام میں آنے
والی ہر چیز خوبصورت اور دل کش ہونی چاہیے اور اس کے
ساتھ اس کے استعمال میں سہولت ہونی چاہیے۔

اب چیزوں کی ترتیب کو لیجیے۔ عام طور پر امیروں کے کمرے
تصویروں اور سجاوٹ کی چیزوں سے پٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ان
سے آنکھ کو سکون اور دل کو خوشی نہیں ہوتی۔ وہاں جائیے تو کچھ
ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی متمدن شخص کے رہنے کی جگہ نہیں
ہے بلکہ کباڑیے کی دکان ہے، کہ جس میں طرح طرح کی
خوبصورت اور نایاب چیزیں جمع کی گئی ہیں لیکن ان میں کوئی ترتیب

نہیں ہے۔ اس کے بجائے اگر کمرے میں سجاوٹ کی کم چیزیں ہوں، لیکن وہ اچھی ہوں اور سلیقے سے ترتیب دی جائیں تو کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ ہو سکتا ہے اور اس میں رہنے سہنے اور بیٹھنے اٹھنے سے سکون اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔

گھر کے بعد بچے کی جمالیاتی تربیت کی ذمے داری مدرسے پر آتی ہے۔ بچے کا احساس حسن اتنا ہی ترقی کرے گا جتنا کہ مدرسے کے ماحول کو خوشنما اور خوبصورت بنایا جائے گا۔ یہ کام استاد کا ہے۔ اگر کمرۂ جماعت کو سلیقے سے سجایا جائے اور اس کی چیزوں کو اچھے ڈھنگ سے ترتیب دیا جائے، تو غیر شعوری طور پر طالب علموں میں خوش مذاقی پیدا ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اساتذہ خود بھی آرٹ کا اچھا ذوق رکھتے ہوں اور انھیں آرٹ کی چیزوں سے سچی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ تصویروں کے انتخاب اور ترتیب میں نیز دیگر آرایشی چیزوں کے استعمال میں عمدہ ذوق کا اظہار ہونا چاہیے۔ کمرۂ جماعت میں کچھ اچھی تصویریں اور گلدان ضرور ہونے چاہییں۔

طالب علموں کو قدرت کی چیزوں کا مشاہدہ کرا کے ان کے سامنے کائنات کا حسن بے نقاب کر کے، سنگ تراشی، پچی کاری، گل کاری وغیرہ کے اچھے نمونے دکھا کر اور کبھی کبھار گرد و نواح کی خوبصورتی اور نمایشی جگہوں کی سیر کرا کے، ان میں خوبصورت چیزوں کو سراہنے اور ان سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مدرسے میں

ڈرامے اور جلسے کرنے اور تیوہار منانے کے سلسلے میں جو آرایشی کام ہوتا ہے، اس میں طالب علموں کو شریک کرکے انھیں عملی طور پر آرایش کے اصولوں سے روشناس کیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر مدرسے میں آرٹ کی باضابطہ تعلیم کا انتظام ہے تو امید ہے کہ طالب علم اس سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھائیں گے۔

۱۱۔ سائنس کی تعلیم

سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور ان نے انسانی زندگی میں بہت سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ آج سائنس قومی ترقی کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ نہ صرف جدید ٹیکنولوجی اور صنعت، بلکہ زراعت کو بھی فروغ دینے کے لیے سائنس کی ضرورت ہے۔ مغربی ممالک نے سائنس کی بدولت مادی اشیا کی پیداوار کے میدان میں شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اپنے شہریوں کے معیار زندگی کو اونچا کیا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی ممالک تاریخی وجوہ کی بنا پر بہت مدت تک سائنس کی برکتوں سے محروم رہے۔ مگر اب ان ممالک میں سائنس کی اہمیت کا احساس دن بدن بڑھ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بالخصوص آزادی کے بعد اس سمت میں اقدامات کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر باضابطہ تعلیم میں سائنس پر اب ہمارے یہاں خاصا زور دیا جا رہا ہے۔

یہی نہیں کہ سائنس کی تعلیم ملک کی پیداوار بڑھانے میں

مددگار ثابت ہوگی۔ بلکہ یہ لوگوں کے نقطۂ نظر اور رویے میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرے گی، جن سے ہمارے روایتی، ساکن سماج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔ ایک ایسی لہر جو سماج کو جدید شکل دینے میں ایک محرکی قوت کا کام کرے گی۔ سائنس کی سب سے بڑی دین اصل میں یہی ہے۔ اسے سائنسی نقطۂ نظر کہتے ہیں۔ ہمارا سماج جس میں توہم پرستی اور تاریک اندیشی کا دور دورہ ہے، سائنس کے بغیر نہ خاطر خواہ سماجی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اقتصادی ترقی۔ سائنسی نقطۂ نظر لوگوں میں پھیلے ہوئے توہمات اور خلاف عقل عقاید پر ضرب کاری لگائے گا۔ سائنس کا انحصار مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ سائنس کسی عقیدے یا خیال کی آنکھیں بند کرکے پیروی نہیں کرتی، چاہے اُس کا ماخذ کوئی بھی ہو۔ بلکہ وہ حقیقت کی کھوج میں مشاہدے، تجربے اور استدلال سے کام لیتی ہے۔ وہ ہر واقعے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ اس طرح سائنس تنقیدی غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس آئے دن طرح طرح کے ایجادات اور انکشافات کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا تمام ترقی پذیر ممالک میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے سائنس کی روشنی کو پھیلانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس طرح رجعت پسندانہ روایات کے نقصان دہ اثرات کو ختم کیا جا سکے گا اور ترقی کی نئی راہیں نکل سکیں گی۔

یوں تو ہمارے مدرسوں میں خاصی مدت سے سائنس کی تعلیم دی جا رہی ہے مگر اسے تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ نصاب

اور طریقۂ تعلیم دونوں ناقص ہیں۔ ہمارے طبعی اور سماجی ماحول سے ان کا بہت کم رابطہ ہے۔ ہمارے دیس کے پچھتر فی صد لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ نصاب کو دیکھیے تو گانو کے مدرسوں میں وہی ہے جو شہری اسکولوں میں رائج ہے۔ کتابیں بھی یکساں ہیں۔ گانو کی بیشتر آبادی کا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ دیہی مدارس میں سائنس کی تعلیم کا ذریعہ زراعت کو بنایا جائے۔ نصاب وضع کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور سائنس پڑھانے میں موادِ تعلیم کو زراعت کے مختلف عوامل اور متعلقہ چیزوں سے مربوط کر کے پیش کیا جائے بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ چیزوں کا بغور مشاہدہ کریں، احتیاط کے ساتھ تجربے کریں اور پھر ان کی بنیاد پر استدلال کر کے نتیجہ یا اصول اخذ کریں۔ اور پھر اس اصول کو مناسب مواقع پر برتیں۔ یہ ہے سائنس کی تعلیم کا صحیح طریقہ۔ مگر ہمارے اسکولوں میں عموماً یہ طریقہ عمل میں نہیں آتا۔ سائنس کا استاد بھی دوسرے مضامین کے استادوں کی طرح میکانکی ڈھنگ سے سائنس پڑھاتا ہے۔ سائنس سے متعلق واقعات، حقائق اور اصولوں کو اکثر طلبہ رٹ لیتے ہیں اور جیسے تیسے امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ نہ ان میں موادِ تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے اور اسے زندگی کے کاروبار میں استعمال کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور نہ سائنسی نقطۂ نظر حاصل ہوتا ہے جو سائنس کی تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ پھر تعجب کیا کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بیشتر لوگ

توہمات میں گرفتار رہتے ہیں!

جس طرح دیہی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو بچوں کے قدرتی ماحول اور زراعت کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے، اسی طرح شہر کے اسکولوں میں شہری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اس کو مربوط کرنا چاہیے۔ مثلاً شہر میں مختلف قسم کی صنعتیں فروغ پاتی ہیں، وہاں پینے کے لیے نل کے پانی اور بجلی کی روشنی کا انتظام ہوتا ہے، پاور سے چلنے والے ذرائع آمد و رفت اور وسائل رسل و رسائل کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس قسم کی تمام چیزیں سائنس کی تعلیم کا ایک مؤثر اور بامعنی ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ اس طرح طلبہ میں تلاش و جستجو کی لگن پیدا کی جا سکتی ہے جو سائنس کی تعلیم ہی کی نہیں بلکہ عصر جدید میں انسانی زندگی کی بنیادی قدر ہے۔ اب انسان کے عقیدے اور عمل کی بنیاد کسی بیرونی قوت کے فرمان پر نہیں، بلکہ اس کے اپنے تجربے پر قائم ہے۔ سائنس کے نزدیک کوئی بھی سچائی قطعی اور آخری نہیں بلکہ آزمائشی چیز ہے اور ثبوت کی محتاج ہے۔ آج تک جس چیز کو سچائی سمجھا جا رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ تجربے کی بنا پر اس میں شبہ پیدا ہو جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسری سچائی لے لے۔

یہ بہت امید افزا بات ہے کہ یونیسکو اور اس کی معاون تنظیموں نے دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں سائنس کی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے خاصی امداد دی ہے۔ چنانچہ ہندستان کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں سائنس کی تعلیم کے معیار کو بلند

کرنے کے لیے یہ تنظیمیں ایک باضابطہ اسکیم پر عمل پیرا ہیں۔ اس اسکیم کے پہلے مرحلے پر ملک کی تمام ریاستوں میں پچاس پچاس پرائمری اسکول اور تیس تیس مڈل اسکول منتخب کیے گئے اور انھیں سائنس کے تجربے کرنے کے لیے ضروری سازوسامان مہیا کیا گیا۔ یونیسکو نے سائنس کا نصاب مرتب کرنے میں بھی مدد دی۔ اس کے مطابق ملک کی مختلف علاقائی زبانوں میں کتابیں لکھی گئیں۔ منتخب اسکولوں کے اساتذہ کو اس نصاب کے مطابق سائنس پڑھانے اور دیے ہوئے سازوسامان کے استعمال کرنے کا ڈھنگ مختصر ٹریننگ کے دوران سکھایا گیا۔ دوسرے مرحلے پر اور زیادہ اسکولوں میں یہ پروگرام چلایا جائے گا۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ ملک کے تمام اسکولوں میں سائنس کا ترقی یافتہ نصاب رائج ہو جائے گا اور تعلیم کے مؤثر طریقے اپنائے جائیں گے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت میں سماج اور گھر کا بڑا حصہ ہے۔ اگر بچے اسکول میں سائنسی طریقہ سیکھ بھی لیں، اور اسکول کے باہر کا ماحول اس کے لیے سازگار نہ ہو تو اسکول کی تعلیم کا اثر کمزور پڑ جائے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بالغوں میں بھی سائنسی نظر پیدا کرنے کی مہم چلائی جائے۔ اس سلسلے میں ان تمام ذرائع کو پورے طور پر استعمال کرنا چاہیے جو تعلیم بالغان کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کا استعمال خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔ قصے، کہانی، تمثیل اور ڈرامے کی شکل میں مروجہ توہمات اور خلاف عقل عقائد پر مؤثر وار کیا

جاسکتا ہے، اور عوام کو سائنسی طریقہ فکر سے روشناس کیا جاسکتا ہے
اگر یہ سب ٹھیک طرح کیا جائے تو امید ہے کہ ہمارے بچے
بڑے ہوکر اُن تعصبات سے پاک ہوں گے جو مذہب، فرقہ یا زبان کے
نام پر ہمارے سماج میں جاری اور ساری ہیں۔ ان کے ذہن لچک دار
ہوں گے اور وہ دلیل اور ثبوت کی روشنی میں اپنی رائے یا عقیدے
میں تبدیل کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اس طرح ہمارا ملک بھی جدید
عالمی تہذیب کو ترقی دینے میں قابل قدر حصہ لے سکے گا۔

حصہ سوم

بنیادی قومی تعلیم

۱۲- بنیادی تعلیم اور سماج

قومی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق آج ہمارے دیس میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہے۔ یہاں تک کہ ہم اپنی منزل کے بارے میں متفق نہیں ہیں کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ اس معاملے میں کہ ہماری زندگی کا کیا نقشا ہونا چاہیے، مختلف جماعتوں کے خیالات ایک دوسرے سے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک طرف ملک کی موجودہ حکومت اور لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کہتی ہے کہ ہماری مادی اور روحانی دونوں قسم کی ترقی کے لیے سوشلسٹ سماج قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں سب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کریں اور اپنی قابلیت اور طاقت کے مطابق ملک کی خوش حالی کو بڑھانے کی کوشش کریں اور اس کی برکتوں سے سب ہی فیضیاب ہوں۔ کسی کو دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا حق نہ ہو۔ اس کے خلاف دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی ایک چھوٹی مگر بااثر جماعت سماج کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ جس کی بنیاد اشتراک عمل کی بجائے باہمی

مقابلے پر قائم ہے اور جس میں اکثریت اپنی محنت کے پھل سے بڑی حد تک محروم رہتی ہے اور اس کا فائدہ چھوٹا سا طبقہ اٹھاتا ہے جس کے قبضے میں دولت پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔

جب قومی زندگی کے مقصد جیسے بنیادی مسئلے میں اس قدر اختلاف رائے ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تعلیم کے معاملے میں جو محض ایک وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے، مختلف جماعتوں کے خیالات جدا جدا ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی ہر ایک منزل کے بارے میں الگ الگ رائیں ہیں کہ اس کی شکل کیا ہونی چاہیے، لیکن جتنے شدید اختلافات ابتدائی تعلیم کے بارے میں ہیں، اتنے شاید اور کسی منزل کی تعلیم کے بارے میں نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد اور روپ کیا ہو، اس موضوع پر اُس وقت سے ایک مسلسل بحث چھڑی ہوئی ہے جبکہ مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں قوم کے سامنے بنیادی تعلیم کا خیال پیش کیا تھا۔ آج ایک تہائی صدی سے زیادہ مدت ختم ہو چکی ہے مگر بحث اب بھی جاری ہے کہ بنیادی قومی تعلیم میں کون سی چیزیں اہم ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی مختلف ریاستوں میں جو تھوڑے بہت مدرسے بنیادی اسکول کے نام سے کھولے گئے ہیں، ان کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں بنیادی مدرسے کہلانے کے مستحق ہیں بھی یا نہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بنیادی تعلیم کے تصور کو تاریخی اور سماجی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش

کریں۔

ہندستان پر برطانیہ کا قبضہ ہوجانے کے بعد یہاں کی حکومت کا ڈھانچہ بھی بدلا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ وہ بنیادیں ہل گئیں جن پر پرانے سماج کی عمارت کھڑی تھی۔ وہ سماج جو صدیوں سے اس دیس میں قائم تھا، ڈگمگانے لگا۔ اس سماج کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اندرونی طور پر کسی بڑی تبدیلی کا پیدا ہونا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کے حقوق و فرائض ان کے اپنے اپنے طبقے کے اعتبار سے متعین تھے اور ان کی پابندی کرانے میں سرکاری حکم یا قانون کا اتنا دخل نہیں تھا، جتنا کہ روایات اور عقائد کا، مثال کے طور پر لوگوں کے پیشے، اختیارات اور سماجی رتبے کا انحصار ذات پات پر تھا۔ یا جو لوگ دولت مند تھے، جن کے پاس جاگیریں تھیں، اُن کے اور اُن کی رعایا کے درمیان حقوق و فرائض کے رشتے واضح تھے۔ اگرچہ ہندستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے کئی ایک حکومتیں بنیں اور بگڑیں، سیکڑوں حاکم، راجے مہاراجے، بادشاہ اور شہنشاہ آئے اور گئے، لیکن ملک کے سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کا اقتصادی ڈھانچا جوں کا توں برقرار رہا۔ بہت پرانے زمانے سے ہندستان کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ کھیتی باڑی تھا گاؤں کی زندگی میں زراعت اور گھریلو دستکاری میں ایسا تال میل تھا کہ زندگی کی کم و بیش تمام بنیادی ضرورتیں گاؤں ہی میں پوری ہوجاتی تھیں۔ گاؤں اس طرح کسی باہری ایجنسی کے محتاج نہیں تھے۔

لیکن دیہی زندگی کی اس تصویر سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ مادی یا تہذیبی لحاظ سے بھری پُری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سماج میں زندگی کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ اور اندرونی طور پر اس زندگی کے امن اور شانتی کو درہم برہم کرنے والے اسباب موجود نہ تھے۔ بظاہر لوگ اپنی موجودہ حالت پر قانع تھے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملک میں کبھی کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ہنگامے برپا ضرور ہوئے، بغاوتیں، جنگیں اور خوں ریزیاں بھی ہوئیں، مگر ان کا اثر حاکموں کی تبدیلی، اور ایک وقتی اُتھل پُتھل سے زیادہ گہرا نہیں ہوا۔ سماجی زندگی پر جمود طاری رہا اور سماج کے مختلف طبقے اور گروہ اپنے اپنے معینہ درجے کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔ اور سماج کے اقتصادی نظام میں توازن قائم رہا۔

برطانوی حکومت کی پالیسی اور طریق کار نے ہندستان کی سماجی زندگی کو تہ و بالا کر دیا اور اس کے اقتصادی توازن کو بگاڑ دیا۔ صنعتی انقلاب کی بدولت انگلستان میں ملک کی ضرورت سے زیادہ چیزیں مشینوں سے بننے لگیں۔ ان کی کھپت کے لیے انگلستان کو ہندستان سے بہتر منڈی اور کہاں مل سکتی تھی۔ چنانچہ ان چیزوں کی تجارت کو ہندستان میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے بڑھاوا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی گھریلو دستکاریاں تباہ ہو گئیں۔ ملک کی زراعت کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے زمینداری کی جو سنستھا قائم کی، اس سے زرعی پیداوار کو بہت بڑا دھکا لگا اور

کسان تباہ ہو گئے۔ اب تک زمین پر کسان کا اپنا قبضہ تھا اور وہ اپنی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ براہِ راست سرکار کو ادا کر دیتا تھا لیکن اب زمینداری کے نئے نظام میں سرکار اور کسان کے درمیان ایک تیسرا شخص "زمیندار" حائل ہو گیا اور وہ خود پیداوار کے عمل میں کوئی خاص حصہ لیے بغیر کسان کی محنت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ زمیندار کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کرنے کی چھوٹ تھی، کیونکہ وہ برطانوی حکومت کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں ہر ممکن مدد دینے کے لیے تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ کسان کی بربادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کھیتی باڑی سے روزی کمانے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ برطانوی صنعت کے حملے کا مقابلہ دیسی دستکاری نہ کر سکی اور دستکاری کو زندہ رہنے کے لیے مجبوراً زراعت کا سہارا لینا پڑا۔ یہ اتنی بھیانک اور دل ہلا دینے والی تباہی تھی کہ اس کا احساس حکومت کے اعلیٰ حلقوں کو بھی ہوا۔ چنانچہ لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل نے اپنے ایک سرکاری مراسلے میں صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "جولاہوں (بنکروں) کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کا رنگ پھیکا کر رہی ہیں۔"

جہاں برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اتنی بڑی مصیبت نازل کی، وہاں نادانستہ طور پر اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ ہندوستانی سماج صدیوں سے جمود کے عالم میں تھا اور لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری حالت ہمیشہ ویسی ہی رہے گی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ بھی

ہے وہ ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی سماجی ناانصافی، بے عزتی، ظلم وتشدد اور حکراں طبقے کی خودسری کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھے۔ وہ طرح طرح کی توہم پرستی کا شکار تھے اور انھیں اس تاریکی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو حالات برطانوی حکمت عملی سے پیدا ہوئے، انھوں نے اس جمود کو توڑا۔ عام تباہ حالی نے ہندستانیوں کو بری طرح جھنجھوڑا اور یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ آخر اس صورت حال سے کیونکر چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ادھر انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندستان کے پڑھے لکھے طبقے میں نئے خیالات ترقی کر رہے تھے، جو در اصل یورپ کے صنعتی انقلاب کی دین ہیں۔ جمہوریت مساوات اور آزادی۔ یہ وہ انقلابی خیالات ہیں جن سے سرشار ہو کر ہندستانیوں نے مختلف قسم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحریکیں شروع کیں اور ان کی بدولت وہ جمود ٹوٹا جو صدیوں سے ہندستانی سماج کو میٹھی نیند سلا رہا تھا۔

برطانوی تسلط کے خلاف ملک میں جو بھی آندولن شروع ہوئے، وسیع معنوں میں ان سب کا کسی نہ کسی طرح عوام کی تعلیم سے تعلق تھا۔ باضابطہ طور پر نہ سہی، بے ضابطہ طور پر یہ سبھی تعلیم کا ذریعہ تھے، کیونکہ وہ عوام میں ایک نئی ذہنیت اور ایک نیا شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بالواسطہ تعلیم کچھ زیادہ کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ جمہوریت کا نیا تصور یورپ سے حاصل ہوا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ عوام کی باضابطہ تعلیم کا سرکاری طور

پر انتظام کیا جائے تاکہ کم از کم تہذیبی میدان میں ترقی کرنے کے سب کو برابر مواقع حاصل ہوں۔ اسی احساس ضرورت نے آگے چل کر عوام کی مفت اور لازمی تعلیم کے مطالبے کی شکل اختیار کرلی۔

انگریزی حکومت کو اپنے ابتدائی دور میں ہندستانیوں کی تعلیم کی ضرورت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد حکومت کو اس طرف تھوڑی بہت توجہ دینی پڑی۔ اس لیے کہ اسے اپنے دفتری کام چلانے کے لیے ایسے ہندستانیوں کی ضرورت تھی جو انگریزوں کے مقابلے میں کم تنخواہ پر سرکاری نوکری کرسکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ بھی فائدہ حاصل ہو کہ وہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک کڑی کا کام کرسکیں۔ یعنی یہ ہندستانی ملازمین حکومت کا آلۂ کار بن کر اسے تقویت پہنچا سکیں۔ گو کہ اس تعلیم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ملک کی آبادی کے ایک بہت چھوٹے حصّے نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھایا مگر سیاسی اور سماجی لحاظ سے دیکھیے تو ملک پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

یہ سچ ہے کہ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندستان کی سیاسی سماجی اور تہذیبی آزادی کی تحریک کے لیے چند غیرمعمولی رہنما حاصل ہوئے ہیں، جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر سے اپنی ذات کو سنوارا۔ جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، سائنسی طریقہ وغیرہ کو خود اپنایا اور ان ہی قدروں کا سہارا لے کر مختلف تحریکوں کی رہنمائی کی۔ لیکن عام طور پر انگریزی تعلیم کا نتیجہ ملک کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے

جب کہ اس کا منشا یہ تھا ہی نہیں؟ جن لوگوں نے یہ تعلیم پائی، ان کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے مقاصد پورے کیے۔

انگریزی تعلیم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سماج میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا، جو رنگ روپ کے لحاظ سے تو ہندستانی تھا مگر اس کی عادتیں، دلچسپیاں اور رہن سہن کے طریقے انگلستان کے حکمراں طبقے سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ پھر کیا تعجب کہ اس طبقے نے ہمیشہ انگریزی حکومت کو قائم رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو کمزور بنانے میں اہم حصہ لیا۔

اس تعلیم سے ایک نقصان اور ہوا۔ ہندستانی سماج پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اب انگریزی تعلیم نے اس میں ایک اور دراڑ ڈال دی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ خود کو کسی اور دنیا کی چیز سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ان دونوں گروہوں میں کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی تعلیم عوام کے لیے تھی ہی نہیں۔ اس سے صرف خواص ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے، صرف وہی لوگ جن کے پاس دولت تھی، جو پہلے ہی سماج کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ اولاً تو یہ تعلیم خاصی مہنگی تھی اور دوسرے، اس کے لیے شہروں میں اسکول قائم کیے گئے تھے، جہاں مالی لحاظ سے کم حیثیت والے اور خاص کر گاؤں کے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی تعلیم سے گاؤں اور قصبے کے چند مال دار لوگوں نے بھی ذاتی طور پر فائدہ اٹھایا لیکن اس تعلیم کا سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور تعلیم یافتہ لوگوں کو شہر اپنی طرف کھینچ لیتے تھے جہاں وہ اپنے لیے جنت بنا سکتے تھے۔ اس لیے گاؤں اپنی آبادی کے ان عناصر سے محروم ہوتے چلے گئے جو شاید نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر مادّی اور تہذیبی لحاظ سے گاؤں کی زندگی کو خوبصورت اور خوش حال بنانے میں کچھ مدد کر سکتے۔ اس طرح دیہی زندگی جو بدیسی حکومت کے ہاتھوں لٹ کھسٹ کر ہر لحاظ سے ویران اور مفلس ہو رہی تھی، اور زیادہ پست ہوتی چلی گئی۔

ہندستان کو انگریزی تعلیم سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ ہے کہ اس نے سماجی زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے تعلیم یافتہ طبقے کو بالکل الگ تھلگ کر دیا۔ یوں تو یہ تعلیم ایک نئی تہذیب کی دعوے دار تھی، لیکن اس نے اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں چرالیں کہ تمام تہذیب کا سرچشمہ انسانی محنت ہے کہ اس کے بغیر نہ تو تہذیبی زندگی کی مادّی چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں اور نہ صحیح معنوں میں وہ اخلاقی اور روحانی قدریں جو حقیقت میں تہذیب کی جان ہیں۔ انگریزی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اتنا اپاہج ہو گیا کہ نہ وہ کسی قسم کی پیداوار میں حصہ لینے کے قابل رہا اور نہ ہی اس میں سماجی زندگی کو سنوارنے کی کوئی اہلیت باقی رہی۔ یہ طبقہ ہر قسم کی جسمانی محنت و مشقت سے گریز کرنے لگا۔ ہر وہ کام جس میں ہاتھ اور لباس کے میلے ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے

نزدیک گھٹیا اور نیچ قرار پایا۔ ہندستانی سماج میں پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر اونچ نیچ کا خیال کیا کم تھا! انگریزی تعلیم نے اس میں جلے پر کوڑھ کا کام کیا۔ زمانے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ملک میں جمہوریت کے خیال کو تقویت پہنچائی جاتی اور لوگوں میں برابری اور باہمی عزت واحترام کے رجحان کو ترقی دی جاتی اور ملک کی خوشحالی کے لیے پیداوار بڑھانے کی مہم میں سبھی شریک ہوتے مگر انگریزی تعلیم کا بالکل اُلٹا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ یہ ہر قسم کی سماجی ترقی کی راہ میں روڑا بن گئی۔

انگریزی تعلیم کے ان مضر اثرات سے آزادی کی تحریک کے لیڈر باخبر تھے۔ چنانچہ قومی پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی ہونے لگی۔ ۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے تعلیم کی ذمے داری صوبوں کی نمایندہ حکومتوں کے سپرد کی گئی تو ہندستانیوں کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ اپنے تصورات کے مطابق ملک کی تعلیمی پالیسی مرتب کریں۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع پر ملک کے سامنے بنیادی قومی تعلیم کا خاکہ پیش کیا۔ گاندھی جی نہ صرف آزادی کے آندولن کے سب سے بڑے نیتا تھے، بلکہ تعلیمی معاملات میں بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ انھوں نے اپنے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران اور بعد میں سابرمتی آشرم میں کچھ تعلیمی تجربے بھی کیے تھے اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے ذہن میں ہندستان کی سماجی ترقی اور خوش حالی کا ایک جامع اور واضح تصور موجود تھا۔ وہ جسمانی محنت ومشقت کو بہرحال

تعلیم کا ایک ضروری حصہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی تعلیم اس وقت تک تعلیم کہلانے کی مستحق نہ تھی، جب تک کہ اُسے سماجی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اس لیے کہ وہ جس قسم کے سماج کو قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ہر ایک فرد کے لیے ایسے کاموں میں حصہ لینا ایک لازمی فرض کی حیثیت رکھتا تھا، جن پر سماج کی خوش حالی اور ترقی کا دارومدار ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد، اخلاقی خوبیاں اور قدریں حاصل کرنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم میں دستکاری اور دوسرے پیداواری کاموں کو مرکزی جگہ دی اور اس کے ساتھ ساتھ ان مشغلوں پر بھی زور دیا جو سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً بستی کی صحت و صفائی کی مہم میں حصہ لینا، سڑکیں بنانا، مریضوں کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس طرح تعلیم ایک خاموش سماجی انقلاب کی علمبردار بنے گی۔ اور ایک ایسا سماج بنانے میں مدد دے گی جس میں سب مِل جُل کر زندگی بسر کریں گے، کوئی کسی کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے گا، ہر ایک شخص سب کی بھلائی کے لیے کام کرے گا اور سب کی کوششوں کا پھل ہر ایک کو نصیب ہوگا۔ گاندھی جی کے آدرش سماج کا روپ یہ ہے اور اسی کو وہ جمہوریت کی روح اور سوشلزم کا نچوڑ کہتے تھے۔

یہ ہے بنیادی قومی تعلیم کا وہ پہلو، جس میں نئے سماجی نظام کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کے اسی

پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ بنیادی مدرسے کا مستقل خرچ بچّوں کے کام سے پورا ہونا چاہیے مگر ہوا یہ کہ بنیادی تعلیم کے اسی پہلو کو عمل میں سب سے کمزور بنایا گیا۔ آزادی سے پہلے بھی یہی حالت تھی اور آج بھی آزادی کے اتنے سال بعد یہی حالت ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد حکومت نے یہ بات سرکاری پالیسی کے طور پر تسلیم کر لی تھی کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا روپ بنیادی تعلیم ہی ہوگا لیکن اکثر مدرسوں میں اس قسم کے کام شروع نہیں کیے گئے جو بنیادی تعلیم کی جان ہیں۔ ایسے مدرسے بہت تھوڑے ہیں جہاں دستکاری یا حرفے کا کام ہوتا ہو مگر یہ بھی کچھ اس طرح کیا جاتا ہے گویا کہے کی لاج رکھنی ہے نہ کوئی کام کی چیز بنتی ہے اور نہ کوئی اور "تعلیمی فائدہ" حاصل ہوتا ہے۔ ایسا 'تعلیمی فائدہ' جس کا ماہرینِ تعلیم کی مجلسوں میں آئے دن چرچا ہوتا رہتا ہے۔

آخر یہ صورت حال کیوں ہے؟ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کا تعلق تعلیم کا انتظام کرنے والوں، استادوں، بچوں کے سرپرستوں وغیرہ سے ہے، لیکن اصل وجہ معلوم کرنے کے لیے مدرسے کی چہار دیواری سے باہر جانا پڑے گا۔ ہماری حکومت نے ہندستان میں سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا اعلان تو ضرور کیا ہے مگر جو طریقے اختیار کیے ہیں ان سے اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارا موجودہ سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں تعداد کے اعتبار سے وہ طبقہ بہت بڑا ہے

جسمانی محنت و مشقت کے ذریعے اپنا پیٹ پالتا ہے اور ملک کی پیداوار اور دولت میں اضافہ کرتا ہے لیکن طاقت کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ طبقہ بہت کم مایہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دولت مندوں کا چھوٹا سا طبقہ بہت طاقت ور ہے۔ اس کا ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی پر بڑا اثر ہے۔ اس طبقے کو جسمانی محنت کرنے اور پیداوار کے کام میں خود حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ کسی ایسی چیز کو گوارا نہیں کرے گا' جس سے اس کی سماجی برتری کو خطرہ ہو۔ بنیادی قومی تعلیم کا یہ اصول کہ دستکاری اور ہاتھ کے کام کو تعلیم میں مرکزی جگہ دی جائے' دولت مند طبقے کے نزدیک اسی قسم کا ایک خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ بنیادی تعلیم کو نہ تو آزادی سے پہلے خوشی خوشی قبول کرنے کے لیے تیار تھا اور نہ اب ہے۔ اس طبقے نے شروع ہی سے اس اصول کی روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اس طبقے کی طرف سے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ دستکاری کو تعلیم میں جگہ دینا تو اچھا ہے کیونکہ اس سے بچے کی تخلیقی قوت کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ذریعے بچے کی شخصیت کے وہ نقوش ابھرتے ہیں جنھیں کتابی تعلیم دبا کر رکھتی ہے مگر اس طبقے نے اس خطرے کا بھی اعلان کیا ہے کہ اگر تعلیم میں پیداوار پر زور دیا گیا تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا خون ہو جائے گا اور بچہ محض کارخانے کا مزدور بن کر رہ جائے گا۔ اسی طرح دوسرے سماجی کاموں مثلاً مدرسہ اور بستی کی صحت و صفائی کے پروگرام میں بچے کی شرکت پر اس طبقے کی طرف سے یہ

اعتراض کیا گیا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں مدرسہ کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے جو بہر کیف پڑھنے لکھنے پر صرف ہونا چاہیے اور اس کے علاوہ بچے کا جسم اور لباس گندا ہو جاتا ہے۔ غرض، بنیادی تعلیم کے اُس بدل کو کمزور بنانے کے لیے طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں پیش کی گئی ہیں، جس کا تعلق سماج کی اصلاح اور ترقی سے ہے اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بنیادی تعلیم کے اس اہم پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور غور طلب ہے۔ فرض کیجیے کہ بنیادی مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور دوسرے سماجی کاموں کو عملاً ویسی ہی اہمیت دی جاتی جیسی کہ ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے لیے ضروری ہے مگر اس قسم کے مدرسے محض نمونے کے طور پر تھوڑی تعداد میں کھولے جاتے اور ملک کے باقی سب مدرسوں میں پرانے ڈھنگ کی کتابی تعلیم ہی ہوتی رہتی، تو کیا بنیادی تعلیم کا مقصد پورا ہو جاتا؟ ہرگز نہیں۔ یہ چند مثالی مدرسے سماجی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی کیسے پیدا کر سکتے! اس قسم کی تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ پوری قوم کی ذہنیت بدلی جائے۔ بنیادی تعلیم دراصل پوری قوم کی تعلیم کا ایک باضابطہ پروگرام ہے۔ سماج پر اس کا اثر پورے طور پر صرف اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے، جب کہ ملک کے تمام بچوں کی ابتدائی تعلیم لازمی طور پر صرف بنیادی مدرسوں ہی میں ہو، اور ان مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور سماجی کاموں کو کھیل کود اور تماشے کے

طور پر نہیں بلکہ اس نیت سے اپنایا جائے کہ وہ نئے سماج کی زندگی کے ضروری اجزا ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے تمام بچّوں کے لیے صرف ایک ہی قسم کے مدرسے ہونے چاہییں، یعنی بنیادی مدرسے۔ اس عمر کے بچّوں کے لیے، ان کا تعلق چاہے کسی طبقے سے ہو کسی اور قسم کے مدرسے نہیں ہونے چاہییں۔

۱۳۔ جمہوریت اور بنیادی تعلیم

آج ہم یہ بہت معمولی بات سمجھتے ہیں کہ ہر بچے کے لیے ریاست کی طرف سے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ایک زمانے میں اس کا تخیل بھی ممکن نہ تھا۔ ۱۹۱۱ء کی بات ہے جب کہ ہمارے ایک قومی رہنما اور محب وطن نے مرکزی مجلس قانون ساز میں لازمی تعلیم کے بل کی حمایت کرتے ہوئے نہایت پُردرد لب و لہجے میں کہا تھا: "جناب والا! میں جانتا ہوں کہ آج کا دن ختم ہونے تک میرا بل نامنظور ہو جائے گا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا اور میں اس وجہ سے بددل بھی نہیں ہوں گا۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے اور میں کہتا بھی رہا ہوں کہ ہم موجودہ نسل کے ہندستانی صرف یہ امید کر سکتے ہیں کہ اپنے ملک کی خدمت اپنی ناکامیوں سے کریں۔ وہ لوگ جن کو یہ سعادت حاصل ہو گی کہ وہ اپنی کامیابیوں سے اس کی سیوا کر سکیں، ہمارے بعد آئیں گے۔۔۔۔ مگر جناب والا! ہماری کوششوں کا جو بھی حشر ہونے والا ہو، ایک بات بالکل صاف ہے۔ ہمیں یہ محسوس کرنے

کا حق ہے کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے! اور جہاں فرض کی پکار صاف ہو، کوشش کر کے ناکام ہونا بہتر ہے بہ مقابلہ اس کے کہ بالکل ہاتھ پیر ہی نہ ہلائے جائیں۔"

گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۱۲ء میں لازمی تعلیم کے لیے جو تجویز پیش کی تھی اس میں صرف ۶ سے ۱۰ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ بھی نامنظور کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے کی اور آج کی حالت میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ہندستان کے موجودہ دستورِ اساسی میں جو ۱۹۵۰ء سے ہمارے یہاں آئین کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ دفعہ ۴۵ میں درج ہے: "ریاست کوشش کرے گی کہ اس دستور کے شروع ہونے سے دس سال کے اندر چودہ سال تک کے تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔"

تعلیم سے متعلق ریاست کے رویے میں جو غیر معمولی تبدیلی نظر آتی ہے یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ یہ تقاضا ہے اس نظامِ زندگی کا جو ہم اپنے دیس میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلے سو سال میں ہندستانیوں نے آزادی اور خوش حالی کے لیے جدوجہد کی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی واضح ہوتی گئی ہے کہ ہماری ساجی زندگی کی تعمیر کس نہج پر ہوگی۔ اس سلسلے میں جمہوریت کو آدرش کے طور پر اپنایا گیا ہے اور جمہوریت کا قیام اس وقت تک ڈانواں ڈول رہے گا، جب تک دیس کے بھی بسنے والے تعلیم اور تہذیب کی دولت سے مالا مال نہ ہوں۔ چنانچہ سب کے لیے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کا مطالبہ جمہوریت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب طریقِ پیداوار کو اس وقت تک بخوبی استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کام کرنے والے پڑھے لکھے نہ ہوں۔ غالباً ازمنہ وسطیٰ میں شہنشاہ اکبر یا شارلی مان ان پڑھ ہونے کے باوجود بہت کامیابی سے اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کر سکتا تھا۔ لیکن آج جدید کارخانے کا معمولی مزدور یا سائنسی طریقے سے کھیتی باڑی کرنے والا کسان صرف اسی صورت میں اپنا کام ٹھیک طرح انجام دے سکتا ہے جب کہ اس میں کم سے کم اپنے کام سے متعلق ضروری ہدایات کو پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت ہو۔ یعنی اس دور میں پیداوار کا انحصار زیادہ سے زیادہ کام کرنے والوں کی تعلیم پر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پیداوار کے استعمال اور کھپت کی غرض سے بھی آج ہر شخص کے لیے پڑھنا لکھنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ وہ اخبارات اور اشتہارات کو دیکھ کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکے۔ چنانچہ لازمی تعلیم کا نعرہ پہلی بار انسانی تاریخ کے اس دور میں سنائی دیتا ہے جبکہ انقلابِ فرانس کے بعد نظامِ سرمایہ داری کے ماتحت نئے طریقِ پیداوار کی داغ بیل پڑتی ہے۔ بہرکیف آج پیداوار کو بڑھانے کے لیے بھی لازمی تعلیم کی ضرورت ہے۔

اس طرح سے دیکھیے تو بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم جمہوری زندگی کی شاہراہ پر ایک بہت بڑا قدم ہے، جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ۷ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ریاست کو کرنا چاہیے۔ اس لیے

کہ جمہوری نظام کا دارو مدار باخبر اور مہذب شہریوں پر ہے، جو اپنی زندگی کی تعمیر اور تنظیم کے لیے سوجھ بوجھ اور سگھڑپن کے ساتھ جماعتی ادارے قائم کر سکیں اور چلا سکیں جو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو پورے طور پر اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ جماعتی زندگی کے حسن کو نکھار سکیں، جو اپنی جنت پکی کرنے کا راز جماعت کی نجات میں ڈھونڈھ سکیں۔ ایک ایسے سماج میں جہاں تعلیم کی سہولتیں صرف چند لوگوں کو میسر ہوں، سب کو نہ ہوں، جماعتی زندگی سکڑ کر رہ جاتی ہے، اس لیے اس کی ترقی میں سب کی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا موقع نہیں ہوتا۔ اس طرح نہ صرف وہ لوگ جو تعلیم سے محروم رکھے جاتے ہیں، گھاٹے میں رہتے ہیں، بلکہ پورا سماج بھی مجموعی حیثیت سے نقصان اٹھاتا ہے۔ لہذا لازمی تعلیم جمہوریت کی پہلی شرط ہے اور اگر یہ ضروری ہے کہ ہر شخص تعلیم سے فائدہ اٹھائے تو یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم مفت ہو، تاکہ سبھی لوگ بغیر کسی مالی دشواری کے اسے حاصل کر سکیں۔ اس لحاظ سے بنیادی تعلیم صحیح معنوں میں جمہوریت کی آئینہ دار ہے۔

مفت اور لازمی تعلیم کا ایک جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے دیس میں گاؤں اور شہر کی تہذیبی زندگی میں جو ایک ناخوش گوار فرق پیدا ہو گیا ہے، اسے مٹایا جائے، سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ساتھ گاؤں کی دولت سمٹ سمٹ کر شہروں میں آگئی ہے۔ ٹیگور کے قول کے مطابق "گاؤں عورت کی مانند ہے" جس کے حسن اور توانائی کے سرچشمے، شہر کے رنگ روپ کی آبیاری کرتے کرتے

خشک ہوگئے ہیں۔ اور اب گاؤں ایک بدصورت بڑھیا کی طرح بے کیف اور غیر دل کش ہو کر رہ گیا ہے۔ گاؤں کی تہذیبی زندگی کو سنوارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں بھی کم از کم ابتدائی تعلیم کا اتنا ہی اچھا انتظام ہو، جیسا کہ شہر میں ہے۔ بنیادی تعلیم کی اسکیم کا منشا یہی ہے کہ آٹھ سال کی لازمی تعلیم کا معیار گاؤں اور شہر دونوں جگہ کے مدرسوں میں یکساں ہونا چاہیے۔ اس طرح گاؤں کی تہذیبی سطح کو اونچا اٹھانے میں مدد ملے گی اور یہ بھی جمہوریت کی طرف ایک قدم ہوگا۔

تعلیمی اعتبار سے ہمارے دیس میں ایک اور چیز جمہوریت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ لوگ جن کو نیچ یا اچھوت کہا جاتا ہے، بڑی حد تک تعلیم سے محروم رکھے گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو نام نہاد اونچی جماعت کے بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر اگر آئینی نہیں تو سماجی پابندیاں ضرور رہی ہیں۔ بنیادی تعلیم اس ناانصافی کو بھی مٹانا چاہتی ہے اور تمام بچوں کے لیے ذات پات کے امتیاز کے بغیر مدرسے کے دروازے کھولنے پر اصرار کرتی ہے۔

اسی طرح ہمارے سماج میں ہاتھ کے کام اور ذہنی کام میں جو فرق روا رکھا جاتا ہے وہ بھی جمہوریت کے حق میں مضر ثابت ہو رہا ہے۔ معمولاً ہاتھ کے کام کو ذہنی کام سے گھٹیا سمجھا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی چند سال پہلے تک تعلیم کے معنی صرف یہ سمجھے کہ آدمی فقط لکھنا پڑھنا سیکھ جائے اور اسے جسمانی محنت مشقت

کا کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں اکثریت ان بچوں کی ہوتی تھی جن کے گھروں میں جسمانی محنت کے کام کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور جو یا تو اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو ذہنی کام کے ذریعے سے اپنی روزی کماتا ہے یا جو اپنی جائداد اور سرمایے کے بل بوتے پر خود بغیر کچھ کام کیے ہوئے فارغ البالی کی زندگی گزارتا ہے۔ ان حالات میں محنت کش طبقے کے بچے عام طور پر تعلیم کی نعمت سے محروم رہتے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کیے جائیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کہ تعلیم کو جمہوری زندگی کی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ اس مقصد کو بنیادی تعلیم نے اس طرح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدرسے میں ایسے عملی کاموں کو خاص جگہ دی ہے، جن سے کوئی نہ کوئی سماجی ضرورت پوری ہوتی ہے۔

ہاتھ کے کام یا بارآور کام کی بنیاد پر ہی جمہوری نظام زندگی کی عمارت بنائی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہی وہ ذریعہ ہے جو زندگی کی تمام مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں نکمے اور نکھٹو اور جونکوں کی طرح دوسروں کا خون چوسنے والے طبقے موجود ہوں، صحیح معنوں میں جمہوری نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت محض ایک سیاسی تصور نہیں ہے کہ تمام لوگوں کو ملک کے سیاسی نظام میں مساوی حقوق حاصل ہوں۔ دراصل جمہوریت کا تصور پوری زندگی پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے

دیکھیے تو جمہوریت کا اصول یہ ہونا چاہیے۔ "جو بوئے گا وہی کاٹے گا' جو کام نہ کرے گا وہ کھائے گا بھی نہیں"

جمہوریت کے اس مفہوم کے پیش نظر ہمیں بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے بارآور کام کی عزت پیدا کرنی ہوگی اور یہ محض وعظ و تلقین یا کتابی تعلیم کے ذریعے سے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم میں کام کو اہمیت دی جائے اور انھیں اس کی سماجی قدر و قیمت کا احساس عملی طور پر دلایا جائے۔ اس طرح ہاتھ کے کام کی طرف بچوں میں جو رجحان پیدا ہوگا وہ ذہنی اور جسمانی کام کے مصنوعی اور غلط امتیاز کو ختم کرنے میں مدد دے گا۔ بنیادی تعلیم میں ہرنے یا دستکاری پر جو زور دیا گیا ہے' اس سے جمہوریت کے اس بنیادی اصول کی پیروی ہوتی ہے۔

جمہوریت کا قومی تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق ہے۔ کسی ملک میں جمہوری نظام کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی تہذیب و تمدن کو فروغ دیا جائے۔ تہذیب و تمدن کا سب سے اہم آلۂ کار زبان ہے۔ لہٰذا وہ تعلیم جو جمہوریت کے مقاصد کو پورا کر سکتی ہے' لازمی طور پر مادری زبان کے ذریعے سے دی جانی چاہیے۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں اسے ایک اصولی حیثیت دی گئی ہے کہ بچے کی تعلیم کا ذریعہ اس کی مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔

بنیادی نصاب تعلیم کی ترتیب اور تدریس میں یہ چیز ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیے کہ اس کے ذریعے سے بچوں میں آٹھ سال کے اندر وہ تمام بنیادی قابلیتیں، مہارتیں' اور رجحانات پیدا ہو جائیں

جو ایک جمہوری سماج کے قائم کرنے اور مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور شہری ذمّے داریوں کو نبھانے کی قابلیت ہے۔ دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بنیادی مدرسے میں اس کے زیادہ امکانات ہیں اس لیے کہ یہاں تعلیم کا مرکز ہاتھ کا کام اور دوسرے سماجی مشغلے ہیں۔

غرض بنیادی تعلیم ایک جمہوری نظام زندگی کی داغ بیل ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں مدد دے سکتی ہے لیکن بنیادی تعلیم کے سامنے ایک خطرہ ہے، جس سے تمام جمہوریت پسندوں کو آگاہ ہونا چاہیے۔ مختلف جگہوں میں بعض بظاہر معصوم اسکیمیں پیش کی جارہی ہیں جو تعلیم کی جمہوری شکل و صورت کو بگاڑ دیں گی۔ یہ تجویز کیا جارہا ہے کہ لازمی تعلیم کی ۷ سے ۱۴ سال کی مدّت میں مختلف قسم کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو سرپرست اپنے بچّوں کی تعلیم پر خرچ کرسکتے ہیں انھیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے بچّوں کو بنیادی مدرسے کی بجائے کسی مڈل اسکول، ہائی اسکول یا پبلک اسکول میں داخل کراسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غریبوں کے بچّے جو خود خرچ کرکے نہیں پڑھ سکتے وہ بنیادی مدرسے میں تعلیم حاصل کریں گے جہاں ہاتھ کے کام کے ذریعے سے تعلیم ہوگی اور امیروں کے بچّے حسبِ دستور دوسرے اسکولوں میں نظری اور کتابی تعلیم حاصل کرتے رہیں گے۔ اس سے ایک طرف تو یہ نقصان ہوگا کہ ذہنی اور جسمانی کام کا فرق قائم رہے گا اور ہاتھ کے کام کو ذلیل اور گھٹیا سمجھا جاتا رہے گا، جو جمہوریت کے حق میں مضر ہے اور دوسری طرف

بنیادی مدرسے کو موزوں اور کافی ساز و سامان اور قابل استادوں سے لیس کرنے سے غفلت برتی جائے گی اور وہاں تعلیم کا معیار نیچا رہے گا اس لیے کہ موجودہ سماج میں جو صاحب اقتدار طبقہ ہے اور جس کی آواز سُنی جاتی ہے، وہ اپنے بچّوں کو دوسری قسم کے اسکولوں میں تعلیم دلوائے گا۔

اس خطرے کے پیشِ نظر یہ بہت ضروری ہے کہ اس بات پر اصرار کیا جائے کہ لازمی تعلیم کی مدّت کے دوران میں سب بچّوں کے لیے ایک ہی مشترکہ مدرسہ ہوگا۔ یعنی بنیادی مدرسہ۔ اس کے علاوہ اس مدّتِ تعلیمی کے لیے کسی اور قسم کے مدرسے کا وجود ممکن نہ ہوگا تاکہ ریاست اپنے ان تمام تعلیمی وسائل کو بنیادی تعلیم کی ترقی کے لیے استعمال کر سکے جو مفت اور لازمی تعلیم کے لیے وہ مہیا کر سکتی ہے۔ بنیادی تعلیم جمہوریت کو صرف اسی صورت میں تقویت پہنچا سکتی ہے۔

۱۴- بنیادی قومی تعلیم کدھر؟

کچھ عرصہ ہوا مجھے ایک سیمنار میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی جو ایک سرانسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ سیمنار کا موضوع تھا 'کیا بنیادی تعلیم ناکام رہی؟' اس قسم کا سوال مختلف تعلیمی اجتماعوں میں بھی اٹھایا جاتا ہے اور جو لوگ تعلیم سے متعلق نہیں ہیں وہ بھی یہی سوال پیش کرتے ہیں۔ اس کا جواب خود سوال ہی میں پنہاں ہے۔ سوال سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بنیادی تعلیم ناکام ثابت ہوئی ہے لیکن صرف بنیادی تعلیم ہی پر آہ و بکا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تعلیم کی دوسری منازل یا اقسام مثلاً ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور تکنیکی تعلیم وغیرہ کے بارے میں تشویش کا اظہار کیوں نہیں کیا جاتا؟ ایسا کرنے سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید بنیادی تعلیم ہی ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے کچھ خاص اسباب ہیں۔

فرض کیجیے، بنیادی تعلیم ناکام ثابت ہوئی، تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہاں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا بنیادی تعلیم کو

اس وجہ سے رد کر دیا گیا ہے کہ تجربے اور عمل کی بنا پر اس میں خامیاں نظر آئیں؟ اور اگر یہ سچ ہے تو ان خامیوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا اس تعلیم کے مقاصد ناقص ثابت ہوئے؟ یعنی کیا یہ جس فلسفے پر مبنی ہے وہ نامناسب ہے؟ یا بنیادی نصاب تعلیم ناموزوں ہے؟ یا پھر اس کا طریقۂ تعلیم ٹھیک نہیں ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ اصولی طور پر، روشن خیال اور پڑھے لکھے لوگوں نے بنیادی تعلیم کو ایک صحت مند تعلیمی نظام قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ شدت کے ساتھ اس کے مخالف ہیں ان کے لیے بھی محض تعلیمی اصولوں کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تعلیم کے ماہرین کو خاص طور پر اور پڑھے لکھے لوگوں کو عام طور سے، اس نظام تعلیم کے بنیادی اصولوں کے صحیح ہونے سے اتفاق ہے۔ ۱۹۶۴-۶۶ء کے تعلیمی کمیشن نے بنیادی تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، کچھ حلقوں میں اسے ماتمی نوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف کمیشن کی رائے ہے کہ "۲۵ سال پہلے مہاتما گاندھی نے بنیادی تعلیم کی جو تحریک شروع کی تھی وہ ہندوستان کی تاریخ تعلیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے قوم کے لیے ایک ایسی تعلیم کا نظریہ پیش کیا جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تعلیم کا مرکز ہاتھ کے کام کو بنایا جائے جو نفع بخش بھی ہو اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بھی۔" کمیشن نے بنیادی تعلیم کے اصولوں کی تعریف میں کہا کہ "ہمیں یقین ہے کہ اس نظام تعلیم کے لازمی اجزا بنیادی طور پر صحت مند ہیں۔

اور تعلیم کی ابتدائی منزل پر ہی نہیں بلکہ ان اجزا میں ضروری ردّوبدل کرکے انھیں قومی نظامِ تعلیم کی تمام منازل پر اپنایا جاسکتا ہے۔ یہ اجزا ہیں ——— (۱) تعلیم میں پیداواری مشاغل، (۲) نصابِ تعلیم میں ہاتھ کے کام اور طبعی اور سماجی ماحول کے ساتھ ربط اور (۳) مدرسے اور سماج کا قریبی رشتہ۔" آخر میں کمیشن نے کہا ہے کہ " بنیادی تعلیم کے اصول بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان اصولوں سے تمام سطحوں پر نظامِ تعلیم کی تشکیل کرنے اور رہنمائی حاصل کرنے میں مدد لینی چاہیے۔" کمیشن نے کہا کہ " ہماری تجویزوں کا نچوڑ یہی ہے اور اسی کے پیشِ نظر ہم اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ تعلیم کے کسی ایک مرحلے کو بنیادی تعلیم قرار دیا جائے۔" غالباً آخری جملے سے بنیادی تعلیم کے مستقبل کے متعلق کمیشن کی سفارشات کے بارے میں کچھ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ایسی صورت میں جب کہ بنیادی تعلیم کے اصول دوسرے تعلیمی مرحلوں پر بھی لاگو ہوسکتے ہیں تو کسی خاص مرحلے کو بنیادی تعلیم کا نام کیوں نہ دیا جائے۔

اس طرح یہ بات تو واضح ہوگئی کہ بنیادی تعلیم کے اصولوں کو اس نظامِ تعلیم کی ناکامی کا سبب نہیں ٹھہرایا جاسکتا تو پھر بنیادی تعلیم کی ناکامی کا سبب کسی اور جگہ تلاش کرنا ہوگا۔ ناکامی کا سبب غالباً اس کے عملی پہلو میں ملےگا۔ مختلف افراد اور جماعتوں نے اس معاملے میں تحقیق کی ہے۔ حکومتِ ہند نے بھی ۱۹۵۶ء میں بنیادی تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی

تھی۔ اس نے بھی ان اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جو بنیادی تعلیم کی ترقی میں حائل ہیں۔ ان سب کا ایک بات پر اتفاق ہے کہ بنیادی تعلیم کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس اسکیم کو نیک نیتی کے ساتھ نہیں چلایا گیا اور متعلقہ انتظامی عملے نے اس پر عملدرآمد کرنے کے لیے ایسے منصوبے بنائے، جن میں خامیاں رہ گئیں۔ جن اسکولوں میں بنیادی تعلیم کا طریقہ رائج ہے ان میں کام کرنے والے استادوں کو مناسب طور سے ٹریننگ نہیں دی گئی۔ ان اسکولوں کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے کے لیے جن مادی وسائل کی ضرورت تھی مثلاً ہاتھ کا کام کرنے کے لیے ضروری سامان اور اوزار، وہ بروقت اور کافی مقدار میں فراہم نہیں کیے گئے۔ تعلیم کے منتظمین اور نگران صاحبان نے عام طور پر اس بات کا کم ثبوت دیا ہے کہ وہ بنیادی تعلیم کی طرف ان کا رویہ اگر مخاصمانہ نہیں تو بے نیازانہ ضرور ہے۔ انتظامی ڈھانچا ایسا ہے کہ طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں جس سے بنیادی تعلیم کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ یہ چیز اس قدر یقین ہے کہ بنیادی تعلیم کی جائزہ کمیٹی نے پُرزور الفاظ میں کہا کہ اگر کوئی ایک سدھار ایسا کرنا ہو جو بنیادی تعلیم کو صحیح راستے پر چلائے تو وہ ہے انتظامی ڈھانچے اور طریقۂ کار کو بہتر بنانا۔

یہ سچ ہے کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم کو چلانے کے لیے جن مالی وسائل کی ضرورت ہے وہ ناکافی ہیں۔ یہ بات اس اسکیم کی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ لیکن بنیادی تعلیم

کی موجودہ زبوں حالی کی خاص وجہ پالیسی مرتب کرنے اور اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے والے انتظامی عملے کی کمزوریاں ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمیں موجودہ صورت حال کی بنیادی وجہ معلوم کرنے کے لیے ذرا گہرائی میں جانا پڑے گا۔ تجزیہ کرنے سے آخر میں یہ پتا چلتا ہے کہ بنیادی تعلیم کے ناکام ہونے کی اصل وجہ ہمارے سماجی ڈھانچے میں ملے گی۔ آج کل ملک میں پیداوار بڑھانے کا بڑا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کی ہندستان کے سماج میں، کچھ بھی اہمیت ہے پیداوار کی سطح بلند کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس بات کا بہت پرچا کیا جا رہا ہے کہ ہندستان کو نہ صرف خوراک کے معاملے میں بلکہ دوسرے شعبوں میں بھی خودکفیل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں زرعی اور صنعتی پیداوار دونوں کی رفتار تیز کرنی ہے۔ ہمارے قومی ترقیاتی منصوبوں میں اس پہلو پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اس کے بغیر سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا مقصد، جو کہ ہمارا آدرش ہے، ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ اب اس بات کو عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ اس مقصد کے حصول میں تعلیم کو اہم رول ادا کرنا ہے۔ اس لیے تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس میں پیداواری مقصد کو پیش نظر رکھا جائے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ پیداوار میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں ہمارے اسکولوں میں کس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

ان اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچے کیا وہ تمام ہنر مندیاں اور طریقہ کار سیکھ جاتے ہیں جو پیداوار بڑھانے میں مددگار ثابت ہوں گے؟ اس سوال کے جواب میں 'ہاں' کہنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ اسکولوں میں عام طور پر جس طرح تعلیم دی جا رہی ہے اس سے نہ تو بچوں میں ایسی ہنر مندی کی نشوونما ہوتی ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو اور نہ پیداواری کاموں میں حصہ لینے کے لیے صحیح رویّہ اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد بنیادی اسکولوں میں بھی پیداواری مشغلے یا ہنر کا کام نہایت بے دلی سے اور سطحی طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ مدرسے اور سماج میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور تعلیم ایک مصنوعی ماحول میں دی جاتی ہے۔ کتابوں کی دنیا اور کام کی دنیا میں بڑی خلیج حائل ہے۔ تعلیم کے موجودہ نظام میں ہاتھ کے کام کو ذلّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس طرح طلبہ سماجی زندگی کے بنیادی اہم عناصر یعنی مادی اشیا کی پیداوار کے کام میں حصہ لینے سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے تعلیمی کمیشن نے کہا ہے کہ "تعلیم یافتہ سفید پوش طبقے کی حیثیت ہمارے سماج میں جونک جیسی ہوگئی ہے اور جو اصل پیداواری مشاغل میں حقیقتاً مصروف ہیں وہ ہیں اَن پڑھ کسان، مزدور اور کاریگر جن کی کارکردگی عموماً نیچے درجے کی ہے۔"

موجودہ صورت حال میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو حکومت کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ تعلیم کو پیداوار کی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور خاص طور پر روشن خیال طبقہ اس پالیسی

کی حمایت کرتا ہے۔ مگر دوسری طرف تعلیم کو صرف کتابی علم تک محدود رکھا جاتا ہے۔ زندگی کی مادّی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پالیسی اور پروگرام، قول اور فعل کے درمیان یہ تضاد کیوں ہے؟ اس تضاد کی جڑیں خود موجودہ سماج کے ڈھانچے میں گہری چلی گئی ہیں۔ سماج کے صاحبِ اقتدار طبقوں نے دماغی کام اور جسمانی محنت، ذہن اور مادّے کو واضح طور پر علاحدہ خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ نام نہاد 'دماغی کام' کو اعلیٰ رتبہ دیا گیا ہے اور جسمانی محنت کو گرا کر ادنیٰ درجے کا بنا دیا گیا ہے۔ ملک کے لیڈر، جن میں سماج کے اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں محنت کے احترام کا بار بار اعلان کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود جسمانی محنت کے ذریعے پیدا کی گئی اشیا کے مقابلے میں دماغی کام کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ پھر کیا عجب کہ بہت سے ماہرینِ تعلیم جن سے بہتر سوجھ بوجھ کی توقع ہے وہ بھی یہ شبہہ ظاہر کرتے ہیں کہ نصاب مدرسہ میں پیداواری کام کو داخل کرنا کوئی پسندیدہ قدم ہے کیونکہ انھیں شک ہے کہ اس طرح مدرسے کا اصل کام یعنی ذہنی نشو و نما کا عمل پس پشت پڑ جائے گا۔

عوام الناس، خاص طور پر نام نہاد دانش ور طبقہ کتابی تعلیم کو زیادہ اور پیداوار کے مقصد سے دی جانے والی تعلیم کو کم اہمیت کیوں دیتا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ اس طرزِ فکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دولت اور رتبے کو سماج میں سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے سماج میں نظریاتی تعلیم کی

بنا پر زیادہ بہتر ملازمتیں ملنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور سوسائٹی میں زیادہ شہرت اور عزت ملتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ نظریاتی تعلیم کے لیے یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ یہ علم کا سرچشمہ ہے۔ اس عقیدے کی تہہ میں یہ مفروضہ پوشیدہ ہے کہ علم محض تصورات کا مجموعہ ہے جنھیں خالص ذہنی عمل کے ذریعے حاصل کیا اور فروغ دیا جا سکتا ہے اور علم کا مادّی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن علم کے بارے میں یہ غلط نظریہ ہے کیونکہ یہ ذہن کو حقیقت سے جدا کرتا ہے اور اس طرح خیال اور عمل ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ در اصل انسانی علم نتیجہ ہے اس عمل اور ردِعمل کا جو انسان کے اور قدرتی اور سماجی ماحول کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔ قدرت کے خلاف جدوجہد کر کے اور سماجی عوامل میں حصہ لے کر ہی انسان نے علم حاصل کیا ہے اور اس کی صحت کو پرکھا ہے۔ آخری تجزیے میں، علم اور انسان کا سماجی عمل دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ سماجی عمل کا ایک بڑا حصہ عبارت ہے انسان کی ان کاوشات سے جو اس کے مادی وجود کے لیے وسائل مہیا کرتی ہیں اور جسمانی محنت، ان کاوشات کا بہت مضبوط آلۂ کار ہے۔ خیالات محض خلا میں فروغ نہیں پاتے، انسان عملی زندگی کے چیلنجوں کا شعوری کوششوں کے ذریعے مقابلہ کر کے ان خیالات کو جنم دیتا ہے اور تجربے اور عمل کی کسوٹی پر ان کے کھوٹے یا کھرے پن کو پرکھتا ہے۔

انسانی تاریخ کی ابتدا میں انسان محض وہی تصورات حاصل

کر سکتا تھا جو خوراک تلاش کرنے کی سعیٔ پیہم سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ علم اور سماجی عمل کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کی نوبت صرف اس وقت آئی جبکہ ذرائع پیداوار اتنے ترقی یافتہ ہو گئے کہ تقسیم محنت کی ضرورت محسوس ہوئی اور نتیجے کے طور پر ذاتی جائداد کا وجود وجود میں آیا، جس کا دارومدار دوسروں کی محنت کے استحصال پر تھا۔ اس منزل پر خیالات و تصورات اپنے طور پر نشوونما پانے لگے چاہے ان کا تعلق حقیقی دنیا سے ہو یا نہ ہو۔ اور طرح طرح کے مکاتب خیال کی تشکیل ہونے لگی۔ اس منزل پر یہ بات ٹھیک اس وجہ سے ممکن ہوئی کہ صاحب جائداد طبقہ علم کو محض علم کی خاطر حاصل کرنے کی تگ ودو میں اطمینان کے ساتھ مصروف رہ سکتا تھا کیونکہ اس کے مادی وجود کو قائم رکھنے کے لیے جو وسائل درکار تھے انھیں محنت کش طبقہ مہیا کرتا تھا۔ جوں جوں سماج نے ذرائع پیداوار اور طریق پیداوار کو فروغ دیا ان دونوں طبقوں کے کام ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہوتے گئے۔ علم اور تہذیب کا اجارہ دار ایک طبقہ بن بیٹھا اور کمر توڑ محنت اور مفلوک الحالی دوسرے طبقے کے نصیب میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ طبقاتی سماج میں نصاب مدرسہ کے اندر نظری علم کو اہمیت دی جاتی ہے اور پیداواری مشاغل کو یا تو نظرانداز کیا جاتا ہے یا اگر نصاب میں شامل کیا بھی گیا تو انھیں غیر اہم سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ موقع کی نزاکت کا تقاضا کبھی مدرسے میں پیداواری کام کی طرف حکومت کے رویئے کو ہمدردانہ بنا دے مگر سچ یہ ہے کہ کبھی اس

کام کو سنجیدگی کے ساتھ کیا نہیں جاتا۔ ہمارا تجربہ بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ بنیادی قومی تعلیم کی روح پیداواری مشغلہ ہے لیکن اس کی کیا گت بنی ہے! اسکولوں میں نہ جانے چرخے کا کتنا سامان بے دردی کے ساتھ ضائع کیا گیا ہے اور بہانا یہ تراشا گیا کہ چرخے کا کام تو محض اس لیے نصاب میں داخل کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ مدرسے کے مضامین کی معلومات کو مربوط کیا جائے نہ کہ اُسے پیداوار بڑھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔

ہمارا مقصد اگر سوشلسٹ سماج قائم کرنا ہے تو پھر نظامِ تعلیم کو، پیداوار کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ پیداوار اور تعلیم کے باہمی رشتے کے بارے میں زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے خلوص نیت کے ساتھ، تمام مادی اور اخلاقی وسائل کو، بروئے کار لانا ہے۔ اسکولوں میں بچوں اور نوجوانوں کو پیداوار کے بارے میں ضروری علم فراہم کرنا ہے اور اس کی طرف ان میں صحیح رجحان پیدا کرنا ہے اور ہاتھ کا کام سکھانا ہے کہ یہی انسان، سماج اور قدرت کے بارے میں علم کی اصل بنیاد ہے اور صحیح معنوں میں یہی تعلیم ہے۔

بنیادی تعلیم، ذہنی اور جسمانی کام کے باہمی امتیاز کو کم کرکے اور پیداواری ہنرمندیوں کو بڑھا کر سوشلسٹ سوسائٹی کے قیام میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوگا، دولت کی تقسیم کو بہتر طریقے سے عمل میں لانے کی طرف رجحان پیدا

ہوگا اور یہ طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کی طرف ایک مؤثر قدم ہوگا۔ اس مقصد کو حاصل کرنا ہے تو بنیادی تعلیم کے پروگرام کو ایک بندھے ٹکے ڈھرے سے ہٹانا ہوگا کہ جس میں چند مخصوص حرفے روایتی طور پر سکھائے جاتے ہیں۔ اس کی جگہ ایسے مشغلے اختیار کرنے ہوں گے جو ترقی یافتہ زراعت، صنعت اور ٹکنالوجی سے ہم رشتہ ہیں۔ تعلیمی کمیشن کے الفاظ میں "اب ضرورت ہے کہ بنیادی تعلیم کی سمت کو از سرِ نو متعین کیا جائے۔ جو بھی پروگرام مرتب کیا جائے وہ ہمارے سماج کی ضرورتوں کے مطابق ہو، جس کی شکل ہم سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے بدلنا چاہتے ہیں۔" ایسا کرنے کی ہم جرأت کرتے تو بنیادی تعلیم کا یہ حشر نہ ہوتا جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور وہ ہندوستان کے روشن مستقبل کی ضامن ہوتی۔

حصہ چہارم

ملک کے تعلیمی حالات

۱۵۔ منصوبہ بند تعلیم

یوں تو ہمیشہ ہر ایک سماج یا تہذیب میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے، لیکن بیسویں صدی سے پہلے جو بھی تبدیلیاں ہوئیں اُن میں کسی منصوبہ بندی یا پلاننگ کا دخل نہیں تھا۔ تبدیلیاں فطری قوانین کے مطابق واقع ہوتی تھیں۔ کسی جماعت نے پہلے سے سوچ سمجھ کر کوئی نقشا نہیں بنایا تھا کہ کس کس قسم کی تبدیلیاں ہونی چاہییں اور اس کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے۔ کسی مخصوص مقصد کے مطابق سماجی ڈھانچے کو بدلنے کے لیے کیا تدابیر ضروری ہیں، اس کی سب سے پہلی مثال ہمیں سوویت یونین میں ملتی ہے، جہاں منصوبہ بندی کی منظم کوشش پہلی بار ۱۹۲۸ء میں پنج سالہ پلان کی شکل میں کی گئی۔ پلاننگ سوویت یونین کی قومی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے اور اس کی بدولت وہاں اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بعض دوسرے سوشلسٹ ملکوں نے بھی اپنی اقتصادی اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے منصوبہ بندی کا طریقۂ کار اپنایا اور اس کا

نتیجہ اچھا ہوا اور اب تو بعض وہ ملک بھی جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے حامل ہیں، اپنی قومی زندگی کے چند شعبوں میں منصوبہ بندی کے اصول کو اختیار کر رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں حصول آزادی سے پہلے ہی پلاننگ کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی ملک کی ترقی کا ایک پلان مرتب کیا تھا۔ آج تمام ترقی پذیر ملکوں میں یہ احساس دن بدن بڑھ رہا ہے کہ محدود وسائل کی وجہ سے بالخصوص منصوبہ بندی کے سوا ان کے لیے ترقی کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد ترقیاتی پلان بنانے کا کام شروع ہوا اور پہلا پنج سالہ پلان ۱۹۵۱ء سے عمل میں آیا۔ اس وقت سے پنج سالہ پلانوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

زمانۂ حال میں عام طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اگر کسی قوم کو ترقی کرنی ہے تو لازم ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرے کیونکہ تعلیم اگر ایک طرف فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے اور اسے تہذیبی لحاظ سے بھرپور زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے تو دوسری طرف تعلیم قومی دولت بڑھانے اور سماج میں خوشگوار تبدیلیاں لانے کا ایک مؤثر آلۂ کار ہے۔

چنانچہ تعلیم کو ہندوستان میں پہلے ہی پہلے پلان سے ہی منصوبہ بندی کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ آیئے، اب ذرا دیکھیں کہ تعلیم

کی پلاننگ سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں، کون سی کمزوریاں ظاہر ہوئی ہیں، اور آئندہ ہمیں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے کہ تعلیم قومی ترقی کے مقاصد حاصل کرنے میں مدد کر سکے۔ ہم نے آزادی کے فوراً بعد طے کیا کہ اپنے ملک میں ایک سوشلسٹ سماج قائم کرنا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں تمام لوگوں کو ترقی کرنے کے برابر مواقع میسر ہوں، جہاں طبقاتی لوٹ کھسوٹ کا امکان باقی نہ رہے یعنی ایک طبقہ دوسرے طبقے کی محنت مشقت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جہاں مذہب، ذات پات، نسل، زبان یا تہذیب کی بنیاد پر کسی فرد کو دوسرے فرد پر فوقیت حاصل نہ ہو اور جہاں علاقائی یا شہری اور دیہاتی عدم مساوات کا سوال پیدا نہ ہو۔

اس مقصد کے پیش نظر ضروری تھا کہ تعلیم کا ایک جامع نظام قائم کیا جائے۔ تعلیم کی سہولتیں خاص کر ان طبقوں کو بہم پہنچائی جائیں جو گذشتہ زمانے میں تعلیم سے محروم رہے ہیں۔ تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ تعلیم ایسی ہو جو ملک کے لوگوں کو اس نئے سماج کی تعمیر کے لیے اکسائے جسے سوشلسٹ سماج کہا گیا ہے۔

منصوبہ بندی کے نتائج کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ملک کی موجودہ تعلیمی حالت کا مقابلہ پلاننگ سے پہلے کی تعلیمی حالت سے کریں۔ پلاننگ شروع ہونے سے پہلے صورت حال یہ تھی کہ بالغ آبادی کے صرف چودہ فی صد افراد خواندہ تھے۔ چھ سے گیارہ سال کے ہر تین بچوں میں صرف ایک بچہ کو تعلیمی سہولت نصیب تھی۔

اور گیارہ سے چودہ سال کے گیارہ بچوں میں صرف ایک بچہ اسکول جا سکتا تھا۔ ثانوی تعلیم کا حال اور بھی بُرا تھا۔ اس منزل پر پچیس بچوں میں صرف ایک بچہ ہائی اسکول میں داخلہ لے سکتا تھا اور ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی کل تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ تھی یعنی اُن نوجوانوں کی تعداد اگر دو سو ہو جو عمر کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم کے قابل تھے تو ان میں سے صرف ایک نوجوان کو یونیورسٹی میں پڑھنے کی سعادت حاصل تھی۔ سائنس، زراعت، انجینیرنگ اور جدید طب کی تعلیم پر نظر ڈالیے تو صورتِ حال صد درجہ مایوس کن تھی۔ اس گئی گزری حالت کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ آبادی کے مختلف حصّوں کی تعلیمی سطح میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم میں، اونچے اور نیچے طبقوں اور ذاتوں کی تعلیم میں، شہری اور دیہاتی لوگوں کی تعلیم میں، ترقی یافتہ اور پس ماندہ صوبوں اور ایک ہی صوبے کے اندر مختلف ضلعوں کی تعلیم میں بیّن عدم توازن کی کیفیت رونما تھی۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کیجیے تو ہماری تعلیم کا معیار ہر منزل پر نیچا تھا۔ مزید، تعلیم اُن اقدار اور رجحانات سے بے بہرہ تھی جو کسی ملک یا قوم کی ترقی کی ضمانت کرتے ہیں، مثلاً حب الوطنی، احساسِ ذمّے داری، جذبۂ ایثار، اتحادِ عمل اور سب سے اہم چیز وہ جوش اور لگن جو ملک کی پیداوار بڑھانے کے لیے اشد ضروری ہے اور جس کی بدولت ملک خوش حال ہوتا ہے۔

آئیے، اب دیکھیں کہ آج ملک کی تعلیمی حالت کیا ہے جہاں

تک تعلیمی توسیع کا تعلق ہے، منصوبہ بندی کے نتائج خاصے امید افزا ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں ۱۹۷۲ء میں جماعت اوّل تا پنجم بچوں کی تعداد ساڑھے چار گنی اور چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک بچوں کی تعداد ساڑھے سات گنی ہو گئی ہے۔ پرائمری جماعتوں میں آج سوا چھ کروڑ سے زیادہ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تعداد اس عمر کے تمام بچوں کی تعداد کے تین چوتھائی حصّے کے برابر ہے۔ آج مڈل جماعتوں میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے جو اس عمر کے بچوں کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منزلوں پر ترقی کی رفتار اس سے بھی زیادہ تیز ہے۔ نویں سے گیارہویں جماعت میں طلبہ کی تعداد دس گنی ہو گئی ہے، اور یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد میں بھی تقریباً اسی نسبت سے اضافہ ہوا ہے۔ ان دونوں منزلوں پر آج طلبہ کی تعداد علی الترتیب چوراسی لاکھ اور پچیس لاکھ ہے۔ بالغوں کی خواندگی کا فی صد بھی پچھلے پچیس سال میں دوگنا ہو گیا ہے۔ تعلیمی سہولتوں میں اضافے کو دیکھیے تو یہ ترقی واقعی قابلِ فخر ہے۔

اس دوران ہندستانی قوم کے کمزور طبقے بھی تعلیمی میدان میں کسی قدر آگے بڑھے ہیں۔ تعلیم کی ہر ایک منزل پر لڑکیوں اور لڑکوں کی نسبت میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پرائمری جماعتوں میں لڑکیوں کی تعداد، لڑکوں کی تعداد کا پینتیس فی صد تھی اور آج یہ ساٹھ فی صد ہو گئی ہے۔ اسی طرح مڈل

جماعتوں میں یہ نسبت اٹھارہ فی صد سے بڑھ کر ۶۳ فی صد، اور ہائر سیکنڈری جماعتوں میں بارہ فی صد سے اٹھائیس فی صد ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں یونیورسٹی کی منزل پر لڑکیاں، لڑکوں کا صرف آٹھ فی صد تھیں۔ آج لڑکیوں کی تعداد اٹھارہ فی صد ہوگئی ہے۔ سماج کے دوسرے پس ماندہ طبقے مثلاً ہریجن اور قبیلے بھی تعلیمی ترقی کے راستے پر کچھ آگے بڑھے ہیں۔ شہر اور گاؤں کی تعلیمی سطح کا فرق بھی کچھ کم ہوا ہے اور ترقی یافتہ اور پس ماندہ علاقوں کے تعلیمی عدم توازن میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

جہاں تک تعلیمی معیار کے اونچا کرنے کا تعلق ہے، بعض مخصوص میدانوں میں کافی کامیابی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہمارے قومی منصوبہ بندی ہی کی دین ہے کہ ملک میں اعلیٰ درجے کی صنعتی، زرعی اور طبی تعلیم کے کئی ادارے قائم ہوگئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اور تعلیمی ریسرچ کو فروغ دینے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور نیشنل لیبورٹیریز نے سائنس اور صنعت کے میدان میں ریسرچ کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ سماجی علوم اور تاریخ میں ریسرچ کی ترقی کے لیے الگ الگ کل ہند ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ چند یونیورسٹیوں میں بھی مخصوص مضامین کی ریسرچ کو بڑھاوا دینے کے لیے اعلیٰ مرکز کا اہتمام کیا گیا ہے۔

یہ ہے ہماری قومی منصوبہ بندی کی تصویر کا روشن رُخ۔ مگر

ہماری تعلیمی پلاننگ کے بعض نتائج خاصے تشویش ناک ہیں۔ مثال کے طور پر اب بھی ہم تعلیمی مواقع کی فراہمی کے معاملے میں عدم مساوات کو ختم نہیں کرسکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں سے نچلا طبقہ بہت کم فائدہ اٹھا سکا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزل پر بھی نچلے طبقے کے بچے بڑی تعداد میں تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔ سوشلسٹ سماج کے پیش نظر تعلیم کا جو رشتہ پیداواری مشاغل کے ساتھ قائم ہونا چاہیے تعلیمی پروگراموں میں اس کی بہت کم جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں کتابی تعلیم بدستور حاوی ہے۔ نصاب تعلیم کا سماجی ضروریات سے بہت کم تعلق ہے۔ سماجی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنے کے لیے جن خیالات، رجحانات اور اقدار کی ضرورت ہے، اُن سے ہماری تعلیم کم وبیش بیگانہ ہے۔ اب تک ہمارے تعلیمی نظام نے طبقاتی خلیج کو پاٹنے میں بہت کم مدد دی ہے۔ ہماری پلاننگ میں بالغوں کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے دانشور طبقے اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھا ہے اور ان میں کوئی رابطہ نظر نہیں آتا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تعلیمی منصوبہ بندی میں جو نسبتاً سب سے آسان کام تھا یعنی توسیع تعلیم، اس میں ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے، گو یہاں بھی اب تک ہم اپنے قومی نشانے سے کافی دور ہیں۔ نہ ابھی ہم چھ سے چودہ سال کے تمام بچوں

کے لیے تعلیمی مواقع فراہم کرسکے ہیں، اور نہ ہی تمام بالغوں کو خواندہ بناسکے ہیں۔ تعلیمی منصوبہ بندی کا جو سب سے اہم مقصد ہونا چاہیے تھا یعنی سماج کی تشکیل نو میں معاونت کرنا، اس کے حصول میں ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ واقعی یہ کام بہت مشکل ہے لیکن ناگزیر بھی ہے۔ ہمیں اب تعلیمی منصوبہ بندی میں اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مطمح نظر کی صفائی اولین شرط ہے۔ پھر عقیدہ، لگن، محنت، انتظامی مہارت اور جہد پیہم درکار ہے۔

۱۶۔ حالیہ تعلیمی رجحانات

ہندستان کی موجودہ صورت حال میں تعلیمی رجحانات کا ذکر کیجیے تو حالیہ زمانے کے بعض حیرت انگیز واقعات کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہ واقعات نہ صرف تعلیمی کام کرنے والوں کے دل و دماغ پر حاوی ہیں بلکہ عوام کے لیے بھی فکرمندی اور تشویش کا باعث ہیں۔ طلبہ مسلسل بغاوت کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں "غصہ زدہ نوجوانوں" کی سرگرمیوں کی سرخیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں اساتذہ میں بھی عام طور سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ ہڑتالیں اور مظاہرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ تعلیمی میدان کے یہ ایسے حقائق ہیں جن سے چشم پوشی کرنا ملک کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن ان رجحانات پر روشنی ڈالنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف ان تعلیمی رجحانات کا ذکر کیا جائے گا جو تعلیمی میدان میں ہمارے ملک کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں، نیز ان رکاوٹوں کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا جو ملک کی تعلیمی

ترقی میں مانع آسکتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں برطانوی دور میں تعلیمی نظام کا ایک محدود مقصد تھا۔ ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے ضروری تھا کہ ادنیٰ درجے کی ملازمتوں کی حد تک ہندوستانیوں کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان رابطہ قائم کر سکیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے پورا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا تھا۔ خوبصورت الفاظ میں اسے "لبرل تعلیم" کہا جاتا تھا۔ یعنی ایسی تعلیم جو انسانی فکر و نظر کو آزادی عطا کرتی ہے لیکن در اصل اس تعلیم کا مقصد بالکل برعکس تھا۔ یہ حقیقتاً پیشہ ورانہ تعلیم تھی لہذا وہ بھی بہت تنگ معنوں میں۔ جو کچھ سکھایا جاتا تھا اور جس طرح سکھایا جاتا تھا' دونوں کا اثر ذہن کو وسعت دینے کے بجائے ایک محدود دائرے میں بند کر دیتا تھا کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کو چند مخصوص خدمات میں کھپائے جو غیر ملکی حکومت نے ہندوستانیوں کے لیے جائز قرار دی تھیں۔ مزید برآں اس تعلیم کی سماجی زندگی کے ساتھ کوئی مطابقت بھی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ عوام سے دور ہوتا گیا۔ اس طبقے کے لوگ خود اپنے ملک میں اجنبیوں کی طرح زندگی گزارنے لگے۔ لیکن وہ حکمرانوں کی توقعات پر پورے اترتے تھے' کیونکہ یہ وفادار ملازمین حکومت برطانیہ کی بہرصورت حمایت کرنا اپنا فرض اولیں سمجھتے تھے۔ اس طرح جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا' اس کے ذریعے ایسے افراد تیار ہوئے جن کے نزدیک

ذاتی مفاد مقدم تھا اور انھیں اس کی بالکل پروا نہیں تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس تعلیم کی اساس بہت محدود تھی۔ صرف خوش حال طبقے کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ جہاں تک عوام کی تعلیم کا تعلق ہے یہ کہا جاتا تھا کہ اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ، عوام تک علم کی روشنی پہنچائیں گے لیکن تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ نہیں ہونے والا تھا۔

ناقص نظام تعلیم کے باوجود ہندستانیوں کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی بدحالی نے قومی بیداری پیدا کی اور کافی طویل جدوجہد کے بعد ہندستانیوں نے آزادی حاصل کر لی۔ قومی تحریک کے باشعور رہنماؤں نے جس نظام تعلیم کو ہمیشہ ناقص اور نقصان دہ سمجھا تھا اس میں آزادی کے بعد تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر گذشتہ پچیس سال کے دوران تعلیمی نظریات میں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کے طریقۂ کار میں کسی قدر بہتری کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

آزادی کے بعد کے دور میں اس پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ تعلیم کا اصل رول کیا ہے۔ تعلیم کو اب قومی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس محدود نظریے سے بالکل مختلف ہے جس کے مطابق تعلیم کو محض فرد کے ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہی نظریہ عملاً رائج تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تعلیمی میدان میں قومی ترقی کے کیا تقاضے ہیں۔ تعلیم اسی وقت بامعنی ثابت ہو سکتی ہے جب ہم اس سماجی نظام

کے پس منظر کو مدنظر رکھیں جو ہم اپنے ملک میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا نصب العین سوشلسٹ قسم کا سماج قائم کرنا ہے۔ اس قسم کے معاشرے میں سب سے پہلے، قومی مسائل کو ترقی دی جاتی ہے جن میں تمام مادی، انسانی، اقتصادی اور ثقافتی وسائل شامل ہیں۔ اس کے بعد ہی ہر شخص کے لیے اطمینان بخش اور خوش حال زندگی کے مواقع فراہم کرنے کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے سماجی نظام کی دوسری شرط قومی دولت پر سماجی کنٹرول ہے تاکہ سماجی انصاف قائم کیا جا سکے اور ہر شخص کو بھرپور زندگی سے فیضیاب ہونے کے مساوی مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ مساوی مواقع فراہم کرنے کا اصول نہ صرف دولت آفرینی کے میدان میں کارفرما ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی مدنظر رکھا جائے کہ جو کچھ پیدا کیا جائے اس میں ہر شخص حصے دار ہو اور اسے استعمال کرنے کے مساوی موقعے حاصل ہوں

اس طرح تعلیم کو آج قومی ترقی کے ان دونوں پہلوؤں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو تعلیم ایسی عادتیں اور مہارتیں پیدا کرے، جو ملک کی مادی دولت میں اضافے کے لیے ضروری ہیں اور دوسری طرف تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ اجتماعی محنت سے حاصل کردہ وسائل سے جائز طور پر فائدہ اٹھانے کا رجحان افراد میں پیدا کیا جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم میں سماجی لحاظ سے نفع بخش کام کو اولین حیثیت حاصل ہے اور اسی طرح ہمہ مقصدی ثانوی تعلیم کی تجویز میں بھی پیداوار پر

زیادہ زور دیا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یہ دونوں اسکیمیں اتنی ترقی نہیں کر سکیں جتنی کہ کرنا چاہیے تھی، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیداواری سرگرمیوں نے ہمارے اسکولوں میں بحیثیت مجموعی کسی نہ کسی طرح ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ آج پیداوار کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کے خلاف لوگوں میں بہت زیادہ مزاحمت کا جذبہ موجود نہیں ہے۔ دراصل ملک کے نفاست پسند اور اعلیٰ طبقوں میں بھی ٹکنیکی تعلیم کا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے اور بہت مہنگے اور خصوصی اسکول جنہیں غلط طور پر پبلک اسکول کہا جاتا ہے، اس بات کے حق میں ہیں کہ طلبہ عملی کاموں میں حصہ لیں مثلاً مٹی کا کام، کاغذ اور گتے کا کام، لکڑی کا کام وغیرہ۔

لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں سب سے زیادہ اہم سماجی ضرورت یعنی پیداوار بڑھانے کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح طریقۂ کار اپنایا جا رہا ہے۔ اب تک اسکولوں میں پیداواری کام سکھانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں دلچسپی محض سطحی ہے اور سکھانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ ناقص ہے۔ اس لیے اس بات پر حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ پیداواری کام سے اتنے متوقع فائدے حاصل نہیں ہوئے اور کام کی طرف طلبہ

میں جو صحیح رویّہ پیدا ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ٹکنیکی اور زرعی تعلیم کے میدان میں بھی خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں جن کا مقصد ٹکنیکی کام سکھانا ہے کم و بیش یہی صورتِ حال ہے یعنی یہاں بھی پیداواری کام کی طرف صحیح رویّے کا اسی طرح فقدان ہے جس طرح عام تعلیم کے اداروں میں۔ اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب لوگ مل کر کوشش کریں جو تعلیمی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمے داری خود اساتذہ پر عاید ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم کو سماجی ضروریات پوری کرنے کے لیے مثبت رجحانات کا حامل بنایا جا سکتا ہے۔ کام نہ کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کرنا کہ جسمانی محنت کے خلاف عام طور پر جو رجحان پایا جاتا ہے، اسکول اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ہم ان مفاد پرستوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہے ہیں جو موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ انتہائی شرمناک شکست ہے۔

اوپر کی سطور میں جس تعلیمی رجحان کا ذکر کیا گیا ہے اسی سے متعلق ایک اور رجحان یہ ہے کہ سماج کے تمام طبقوں کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہ سماجی انصاف کا بنیادی اصول ہے۔ ایک طرف تو اس سے فرد کی صلاحیت کو خود اس کے ذاتی مفاد میں فروغ دینے کا امکان پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ سماج کے اجتماعی وسائل میں اضافے کے لیے

بھی نہایت اہم ہے۔ گذشتہ پچیس سال کے دوران تعلیم کی بنیاد مسلسل وسیع تر ہوتی گئی ہے۔ اگرچہ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ میں کی گئی ہدایت کے بموجب ملک ابھی تک چودہ سال تک عمر کے تمام بچوں کو مفت، لازمی ابتدائی تعلیم مہیا نہیں کر سکا ہے، تاہم کثیر تعداد میں اس عمر کے بچوں کو اسکول جانے کی سہولتیں فراہم کی جا چکی ہیں اور موجودہ اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء تک اس دستوری ہدایت کی تکمیل ہو جائے گی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اب جو بچے اسکولوں میں جاتے ہیں ان میں کافی تعداد ایسی ہے جن کی سابقہ نسلوں نے یعنی باپ، دادا یا والدین نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اتنی بڑھ رہی ہے کہ تعلیمی اداروں کی تعداد اور ان میں طلبہ کے لیے نشستیں بڑھانے کے باوجود ابتدائی اور ثانوی دونوں منزلوں پر طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے تعلیمی سہولتیں ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کی سطح پر بھی تعداد میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم کی توسیع اتنی تیزی سے ہو رہی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ڈسپلن کا مسئلہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ڈسپلن کی خرابی کا ایک سبب یہ ہے کہ طلبا کی تعداد میں یکایک غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے ہے، جن کی روایات جدا جدا ہیں اور جن کی اقدار ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں لیکن ابھی تک نچلے طبقے

کو اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کا نسبتاً بہت کم موقع ملتا ہے۔

بعض لوگ نفسیاتی اصولوں اور بظاہر معقول دلیلوں کا سہارا لے کر تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ذہانت، صلاحیت، رجحان اور قابلیت کے اعتبار سے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف صلاحیتوں کے طلبہ کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنا، قومی وسائل کو ضائع کرنا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کم ذہین اور کم صلاحیت والے بچے اعلیٰ قسم کی تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کے اتنے مستحق نہیں ہیں جتنے کہ زیادہ ذہین بچے۔ لیکن بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس دلیل میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔ اول تو ذہانت اور دوسرے رجحانات جنھیں ہم پیدائشی اور موروثی سمجھتے ہیں در اصل سماجی اور مادّی حالات کی دین ہوتے ہیں اور بڑی حد تک ان کا تعلق اس ماحول سے ہوتا ہے جس میں فرد کی نشوونما ہوتی ہے۔ دوم، پہلے سے قطعی طور پر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ تعلیمی مواقع کے سلسلے میں کس کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ تمام بچّوں کو مساوی مواقع فراہم کرنے کے بعد ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی مخصوص چیز کے سیکھنے میں بچّوں کی صلاحیت ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہے۔

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایسے بچّوں کو جو یکساں استعداد اور صلاحیت نہ رکھتے ہوں برابر سمجھنا اتنی ہی بے انصافی ہوگی جتنی کہ مساوی استعداد رکھنے والوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کرنا۔ یہی وجہ

ہے کہ وہ لوگ حق بجانب نہیں ہیں جو انصاف اور مساوات اور بعض اوقات جمہوریت کا نام لے کر سماج کے کمزور طبقوں کو دی جانے والی ان مراعات اور خصوصی سلوک کی مخالفت کرتے ہیں جو خاص طور پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کو دستورِ ہند کی دفعہ ۴۶ کے تحت حاصل ہیں۔ ہمارے سماج کے ان طبقوں کی پس ماندگی کی تاریخی وجوہات ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ فطری یا پیدائشی طور پر کمتر ہیں۔ یہی بات عورتوں اور کچھ دوسرے پس ماندہ فرقوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں طاقت ور حکمراں طبقے نے صدیوں سے دبا کر کمتر حیثیت میں رکھا ہے۔ اگر ہمارے سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس تاریخی ناانصافی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کمزور طبقے کے مفادات ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ تعلیم اور روزگار دونوں میدانوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن یہاں بھی اس سمت کی راہ عمل میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے مفاد پرست عناصر چپکے چپکے کام کرتے ہیں۔ پیشہ ورانہ کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں میں سماج کے کمزور طبقوں کے لیے گرانٹ اور وظیفے تو ضرور مخصوص کیے گئے ہیں اور ان کے لیے نشستیں بھی متعین کی گئی ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس تناسب سے ان کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے سلسلے میں ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ آئین کی دفعہ ۴۶ کو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے

تاکہ ایک طرف تو ہر قسم کے مکر و فریب سے باخبر رہا جائے اور دوسری طرف پس ماندہ طبقوں کی ترقیاتی سرگرمیوں کو تقویت پہنچانے کے پختہ ارادے کو بروئے کار لایا جائے اور ٹھوس عملی اقدامات کیے جائیں۔

اسی کے ساتھ وابستہ تعلیم کا ایک رجحان قابل غور ہے اس سے میری مراد تعلیمی منصوبہ بندی سے ہے جو کہ قومی ترقی کی مجموعی منصوبہ بندی کا جزو لاینفک ہے۔ موجودہ دور میں پلاننگ کی عالمگیر حیثیت ہو گئی ہے۔ کوئی بھی ملک خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، اسے نظرانداز نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ صنعتی طور پر اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک نے بھی جن کی معیشت، کاروبار کی آزادی کے اصول پر مبنی ہے، اپنی قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں عدم توازن کو دور کرنے کے لیے کسی نہ کسی شکل میں پلاننگ کی طرف رجوع کیا ہے۔ ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں میں جہاں مادی اور انسانی وسائل بہت ناکافی ہیں، پلاننگ کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندستان اس وقت ترقی کے جس مرحلے میں ہے اس کے پیش نظر اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے محدود وسائل کو بے تکے پن سے استعمال کرے۔ ہمیں اپنی قومی ترقی کے نصب العین کے پس منظر میں اپنے طویل مدتی اور حالیہ مقاصد کے حصول کے لیے ترجیحات طے کرنا ہوں گی۔ اس لیے پلاننگ کا ایک منظر ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ قومی ترقی کی منصوبہ بندی میں تعلیم کے رول کو دونوں طرح سے دیکھنا ہوگا۔ ایک تو اس طرح کہ تعلیم ملک کے انسانی وسائل میں اضافے کے لیے ضروری ہے اور دوسرے اس طرح

کہ تعلیم، سماجی خدمت کی ایک قسم ہے جس کے ذریعے انسان کی انفرادی اور سماجی دونوں لحاظ سے نشو و نما ہوتی ہے۔ تعلیم کو ایک طرف تو ترقی پذیر معیشت اور خدمات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد مہیا کرنا ہوں گے اور دوسری طرف تعلیم کا کام یہ ہوگا کہ ایسے مہذب مرد اور عورتیں اُبھر کر سامنے آئیں جو اپنی شخصی زندگی کی تشکیل و تربیت نیز سماج کی فلاح و بہبود کے لیے عقل سلیم کو بروئے کار لاسکیں۔ تعلیم کی منصوبہ بندی اس طرح کی جانا چاہیے کہ یہ مقصد حاصل ہو سکے۔

گزشتہ پچیس سال کے دوران ہندستان میں تعلیم کے شعبے میں بھی اسی طرح منصوبہ بندی کی گئی ہے جس طرح قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ گزشتہ پانچ سالہ منصوبوں کے نتایج ہمارے سامنے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہر سطح پر تعداد کے اعتبار سے کافی توسیع ہوئی ہے لیکن ہر ایک پلان میں جو نشانے مقرر کیے گئے تھے وہ اکثر پورے نہیں ہوئے۔ کچھ نہ کچھ مجوزہ کام نامکمل رہ گیا۔ منصوبہ بندی کے سلسلے میں کچھ بین غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً نشانوں کو ضرورت سے زیادہ اونچا مقرر کرنے میں حقیقت پسندی کے احساس کی کمی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے لیے جو مادی اور انسانی وسائل درکار تھے ان پر حقیقت پسندی کے ساتھ پہلے سے غور نہیں کیا گیا۔ حقیقت پسندی کی کمی کا اظہار اس طریقۂ کار سے بھی ہوتا ہے جو پلاننگ میں اختیار کیا گیا۔ پلاننگ بالکل اوپر سے شروع کی گئی۔ تمام اعداد شمار مرکز کی طرف

سے اکٹھے کیے گئے، اور انھیں اعداد و شمار کی بنیاد پر منصوبوں کی تشکیل کی گئی۔ ان مخصوص حالات پر توجہ نہیں دی گئی جن کے تحت منصوبے پر عملدرآمد ہونا تھا۔ اس غلطی کو درست کرنا ضروری ہے۔ اگر متعینہ قومی مقاصد کی روشنی میں پلاننگ کا کام انفرادی اداروں یا مقامی حالات کی بنیاد پر شروع کیا جاتا تو شاید زیادہ حقیقت پسندانہ اور مربوط قومی پلان تشکیل دیا جاسکتا تھا۔

اس تنقید میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم یعنی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کو ان منصوبوں میں خاطرخواہ ترجیح نہیں دی گئی ہے۔ ایک ماہر تعلیم کا یہ قول ہندستان کی موجودہ تعلیم پر صادق آتا ہے کہ ہماری تعلیمی عمارت کی نہ بنیاد مضبوط ہے اور نہ اس کی چھت محفوظ اور پائیدار ہے۔ عوام کی کثیر تعداد جسے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کی ضرورت ہے، در اصل قومی دولت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے عوام کی تعلیم کو ہماری تعلیمی منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ اہمیت دی جانا چاہیے تھی۔

مزید برآں تعلیم کی تیزی کے ساتھ توسیع کرنے کے جوش میں تعلیمی معیار کے پہلو کو نظرانداز کر دیا گیا۔ طلبا اور تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو برابر توسیع ہوتی رہی مگر تعلیمی معیار پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ اناطول فرانس نے کتنا صحیح کہا تھا کہ لوگ مرجانا پسند کریں گے لیکن غور و فکر کرنا نہ چاہیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اب پلاننگ کرتے ہوئے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا جائے۔

اب نصاب تعلیم اور پڑھانے کے ان چند اہم رجحانات پر غور کرنا ہے جو اس تعلیم کے پس منظر پر پورے اترتے ہوں جس کا خاکہ بالائی سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم رجحان نصاب تعلیم اور تعلیمی مواد کو بہتر بنانے کی باشعور کوشش کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ رجحان خاص طور پر سائنس اور سماجی علوم کے میدان میں بہت نمایاں ہے۔ اگر تعلیم قومی ترقی میں اپنا رول ادا کرنا چاہتی ہے تو ان تمام مضامین کا مناسب مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

آج کی دنیا میں ہر ایک صنعت اور ٹیکنولوجی کی بنیاد سائنس پر ہے۔ جدید دنیا میں تمام تر ترقی کا سرچشمہ سائنس کا علم نہیں بلکہ وہ جذبہ یا نقطۂ نظر ہے جو سائنسی طریقوں کو اپنانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسکولوں کے نصاب اور عام تعلیم کے ایک حصے کے طور پر انڈر گریجویٹ تعلیمی پروگرام میں سائنس کی تعلیم پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ ایک خوش گوار رجحان ہے۔ علم کی حالیہ حیرت انگیز ترقی بالخصوص سائنس کے میدان میں علم کی ترقی کے پیش نظر اسکولوں کے نصاب میں سائنس کے موادِ تعلیم کا معیار بلند کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جو اساتذہ اسکولوں میں کام کر رہے ہیں ان کے لیے ایسے پروگرام شروع کیے جائیں جن کی مدد سے وہ ان چیزوں سے روشناس ہو سکیں جو انھیں نئے نصاب کی رو سے پڑھانا ہوں گی۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن سب سے زیادہ نتیجہ خیز چیز جو سائنس کے مطالعے سے حاصل ہونی چاہیے اس پر اتنی توجہ

نہیں دی جا رہی ہے جتنی کہ ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جدید دور میں تمام ترقی کی بنیاد سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے سائنس ہی کے معلمین میں نہیں بلکہ دوسرے مضامین پڑھانے والے تمام استادوں میں سائنسی رجحان کا رفرما ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود معقول طریقے پر چیزوں کا مشاہدہ کر کے نتیجے اخذ کریں۔ انھیں کسی روایت یا طاقت کے دباؤ میں آکر خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو بغیر جانچے پرکھے کسی بھی نظریے کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں توہم پرستی اور تاریک اندیشی اتنی زیادہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اسکول کی فضا پر بھی یہ چیزیں چھائی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی نادانستہ اور کبھی دانستہ طور پر اسکول پروگراموں کے ذریعے انھیں اور تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ اس لیے محض سائنسی معلومات فراہم کرنا کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ میں مشاہدے، تجربے اور تجزیے کی اور نتائج اخذ کرنے اور انھیں برتنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہہ دیجیے کہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کیا جائے تب کہیں جا کر تعلیم موجودہ توہمات اور تعصبات کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

جہاں تک اسکول کے نصاب اور انڈر گریجویٹ تعلیمی نصاب میں سماجی علوم شامل کرنے کا سوال ہے تو جس طرح سائنس کے سلسلے میں اسی طرح اس معاملے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون

کو اس طرح پڑھایا جائے کہ طلبا میں سماج کے مختلف اداروں اور طریقۂ کار کے بارے میں صحیح رویّہ اپنانے اور ان کو ٹھیک طور سے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں زبان، ذات پات، مذہب، علاقے اور کلچر کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس مضمون کے مطالعے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس بات میں شبہ ہے کہ کیا سماجی علوم کے مطالعے سے ہمارے طلبہ میں کثرت میں وحدت کا نظریہ پیدا ہو بھی رہا ہے جیسی کہ توقع ہے۔ قومی ترقی کے لیے ملک میں موجود مختلف النوع معاشروں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سائنسی نقطۂ نظر اپنانا۔ یہاں پھر استاد کا رول توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

دو رجحانات اور قابلِ ذکر ہیں، میرا خیال ہے کہ تعلیمی ترقی میں ان کی کافی اہمیت ہے۔ اس میں ایک رجحان کا تعلق طلبا کی ترقی کا جائزہ لینے سے ہے، جسے جائزہ (EVALUATION) کہا جاتا ہے اور دوسرا توسیعی پروگراموں کے ذریعے ان اساتذہ کی کارکردگی کو بہتر بنانا ہے جو اسکولوں میں کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں جائزہ کا مطلب، طلبہ کی مجموعی ترقی کے مختلف پہلوؤں یعنی علمی استعداد، کردار، شخصیت وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا مقصد ایک خاص وقت میں محض طلبہ کی علمی نشو و نما کو ریکارڈ کرنا اور اس کی تصدیق کرنا ہی نہیں ہے بلکہ جائزے کا اصل مقصد، ترقی کے پورے عمل میں مدد کرنا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد ہی کہ جوتا کس جگہ کاٹتا ہے، اس کی مرمت کرائی جاتی ہے۔

جائزہ یا جانچ، تعلیمی طریقۂ کار کا جزو لاینفک ہے۔ گذشتہ دس سال کے دوران جائزہ کا نظریہ اساتذہ، تعلیمی منتظمین اور سرکاری امتحانات سے متعلق حکام میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اس مقصد کے تحت سیناروں، کانفرنسوں اور جلسوں کا انتظام کیا جارہا ہے۔ "جائزہ" اب اساتذہ کی تعلیم سے متعلق تمام پروگراموں کا ایک ضروری حصہ ہوگیا ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں امتحانات لینے والے کچھ اداروں نے امتحانات کی تکنیک میں تبدیلیاں بھی کردی ہیں۔ اس کا اظہار اس لائحۂ عمل سے ہوتا ہے جو اسکولوں میں اختیار کیا جارہا ہے لیکن اس سب کے باوجود تعلیم کی مجموعی ترقی پر جائزے کے نئے تصور کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے پر تعلیم کے دوسرے لوازمات سے الگ ہوکر غور کیا گیا ہے۔ جائزے کو جب تک نصاب اور پڑھانے کے پورے معاملے کے ساتھ منسلک کرکے اس پر غور نہ کیا جائے گا، اس وقت تک محض نئی تکنیک استعمال کرنے سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

اب اس بات میں صداقت نہیں رہی ہے کہ جو ایک مرتبہ استاد ہوگیا وہ ہمیشہ کے لیے استاد ہے۔ استاد کو بھی دوسرے پیشے کے لوگوں کی طرح ان تمام ترقیوں کے بارے میں جدید ترین معلومات ہونا چاہیے جو تعلیم کے میدان میں ہوتی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اساتذہ کی یہ مخصوص ضرورت پوری کرنے کے سب سے زیادہ اہل استادوں کے مدرسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت سے کالجوں کو توسیعی پروگرام ترتیب دینے کا کام سونپا گیا ہے، تاکہ

اساتذہ اپنے اپنے اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنا سکیں۔ اس سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے اس کی بہت سی رپورٹیں موجود ہیں۔ جو اساتذہ ملازمت کرتے ہوئے اپنی علمی اور پیشہ ورانہ استعداد بڑھانا چاہتے ہیں ان کے پروگراموں کو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے زیادہ پائیدار اور بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

۱۷۔ خواندگی کی رفتار

دورِ جدید میں اس امر کی اہمیت کو ہر ملک میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر ایک شخص کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ اس کی وجوہ یہ ہیں: اوّل، یہ جمہوریت کا زمانہ ہے اور جمہوری سیاسی نظام کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوام پڑھے لکھے ہوں تاکہ جمہوری طرزِ حکومت میں سمجھ بوجھ کر حصہ لے سکیں اور جمہوریت کے مقاصد کو حاصل کر سکیں۔ دوم، تعلیم کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منور کیا جا سکتا ہے۔ اور سوم یہ کہ جدید صنعتی اور زرعی پیداوار کی ترقی میں تعلیم کی بنیادی حیثیت ہے۔ غرض، زمانۂ حال میں تعلیم ایک ایسی ضرورت ہے جسے نظر انداز کر کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی چنانچہ دنیا کے تمام پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں تمام شہریوں کو خواندہ بنانے کی طرف خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔

ہندستان میں حصول آزادی کے بعد خواندگی کے میدان میں بعض اقدامات کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر شرحِ خواندگی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے گو کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک خواندگی کی رفتار میں جو

ترقی ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیانی وقفے کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی مگر چند ایک تجربات خاصے کامیاب ثابت ہوئے ہیں، جن سے یہ امید بندھتی ہے کہ مالی اور دیگر دشواریوں کے باوجود ناخواندگی کی لعنت کو ختم کیا جاسکتا ہے

۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت اندازاً ملک کی صرف چودہ فی صد آبادی خواندہ تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کے فی صد میں ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں کوئی دو فی صد اضافہ ہوا۔ اگلے دس سال یعنی ۱۹۶۱ء میں ملک کی آبادی میں تقریباً ایک چوتھائی لوگ خواندہ ہو گئے اور ۱۹۷۱ء میں تیس فی صد لوگ پڑھے لکھے تھے۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں خواندگی کا فی صد مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس ترقی میں مرد اور عورتیں دونوں حصے دار ہیں۔ پھر بھی اس معاملے میں عورتیں، مردوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندستان میں صدیوں سے عورتیں تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ رہی ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں مرد ساڑھے انتالیس فی صد اور عورتیں ساڑھے اٹھارہ فی صد خواندگی کے زمرے میں شامل کی گئی ہیں۔ مگر اس ترقی کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ خواندگی کی شرح میں اضافے کے باوجود ان پڑھوں کی اصل تعداد گھٹنے کے بجائے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ملک میں تقریباً تیس کروڑ آدمی ناخواندہ تھے مگر ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد انتالیس کروڑ ہو گئی۔ یعنی بیس سال کی مدت میں تقریباً نو کروڑ ان پڑھ اور زیادہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی تیزی سے

ساتھ ہمارے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے اتنی رفتار سے خواندگی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ دوسرے غیر ترقی یافتہ ملکوں کی طرح غیر معمولی طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہمارے ملک کی ہر قسم کی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ امید ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی مہم میں کامیابی کے ساتھ ساتھ ناخواندگی کا مسئلہ بھی حل ہوتا جائے گا۔ تاہم خواندگی کی جدوجہد کو تیز تر اور موثر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر دیہی آبادی اور عورتوں پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی جن پر ناخواندہ آبادی کا بیشتر حصہ مشتمل ہے۔ دوسرے، اُن لوگوں پر زیادہ توجہ دینی ہوگی جن کی عمر پندرہ اور چوالیس سال کے درمیان ہے، اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صنعتی اور زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قومی زندگی کے ہر شعبے میں فعال حیثیت سے حصہ لینے کے اہل ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھیے، تو اس عمر کے اَن پڑھوں کی تعداد بھی اس وقت سولہ کروڑ ہے۔ اس سے خواندگی کے مطلوبہ پروگرام کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد کو جلد از جلد خواندہ بنانا ہے۔ یہ اتنا بڑا اور مشکل کام ہے کہ وہ قومیں بھی جو اقتصادی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہیں، آسانی سے نہیں کر سکتیں۔ پھر بھلا ہندستان جیسا ملک جس کو قومی زندگی کے ہر میدان میں قدم بڑھانا ہے، اپنے محدود وسائل کی بنا پر کیوں کر ایک مختصر مدت میں تمام لوگوں کو خواندہ بنا سکتا ہے۔

ہم نے خواندگی کی اہمیت کو پہلے پنج سالہ پلان ہی میں تسلیم

کر لیا تھا۔ چنانچہ سماجی ترقی اور توسیعی خدمات کے جو پروگرام ترتیب دیے گئے، ان میں خواندگی کی مہم بھی شامل تھی۔ لیکن زیادہ زور سماجی تعلیم پر دیا گیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ ناخواندہ بالغوں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دینا اور پھر تعلیم میں ان کی دلچسپی کو قائم رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس مسئلے کو کسی حد تک مہاراشٹر ریاست میں کامیابی کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔ وہاں "گرام شکشن مہم" (دیہی تعلیمی مہم) ایک عوامی تحریک کی شکل میں چلائی گئی۔ اس معاملے میں گاؤں میں ایک صحت مند مقابلے کی اسپرٹ پیدا ہوئی۔ انھوں نے بیشتر اپنے ذاتی وسائل کو استعمال کرکے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ جلد از جلد پورے گاؤں کو خواندہ بنادیا جائے۔ گاؤں کے تمام سماجی کارکن اور تعلیم یافتہ نوجوان اس مہم میں رضاکارانہ طور پر شامل ہیں۔ ہر ایک گاؤں میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم کی گئی ہے، جو مختلف قسم کے دیہی اداروں کے نمایندوں پر مرکب ہے۔ مثلاً اسکول کمیٹی، کاشت کاروں کی یونین وغیرہ۔ اس کمیٹی کی رہنمائی اور نگرانی میں خواندگی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ پڑھنا لکھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی کے ترقی یافتہ طریقے، اشتراک عمل، صحت مند عادات بھی سکھائی جاتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے اس مہم کی ہمت افزائی اس طرح کی گئی ہے کہ جب کسی گاؤں کے تمام باشندے خواندہ ہو گئے تو گاؤں کی پنچایت کو ہر ان پڑھ بالغ کے خواندہ بنانے کے صلے میں پچاس پیسے کا عطیہ دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء تک تقریباً

چھبیس ہزار سات سو گاؤں سو فی صد خواندہ ہو گئے اور تک بھگ اسی لاکھ ان پڑھ بالغوں کو تعلیم یافتہ بنایا گیا۔ یہ جماعتی اشتراکی عمل کی ایک شاندار مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹر کو اس کامیابی پر بین الاقوامی انعام ملا ہے۔ اس مثال کی تقلید بعض اور ریاستوں نے کی ہے۔ چنانچہ مغربی بنگال میں ۱۹۶۹ء میں طلبہ نے دیہی علاقے کو خواندہ بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر ایک عوامی مہم کا آغاز کیا، جس میں ہزاروں طلبا نے شرکت کی۔

۱۹۶۴-۶۶ء کے تعلیمی کمیشن نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ خواندگی کے پروگرام کو ایک عوامی تحریک کی شکل دینا چاہیے جس میں تمام تعلیم یافتہ مرد اور عورتوں کو شرکت کرنے کی ترغیب دی جائے اور مقامی وسائل کو پورے طور پر استعمال کیا جائے۔ کمیشن کی اس سفارش کی جھلک ہندستان کی قومی تعلیمی پالیسی میں بھی دکھائی دیتی ہے، جس کا اعلان حکومت ہند نے ۱۹۶۸ء میں کیا تھا۔ اس اعلان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خواندگی کے پروگرام میں پڑھنا لکھنا سیکھنے والے کی زندگی کی ضرورتوں کو مرکز بنانا چاہیے۔ وہ جو کچھ پڑھے لکھے اس کا مصرف اس کے پیش نظر ہو۔ وہ اگر کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے، تو وہ اپنی خواندگی کو زرعی پیداوار کو بڑھانے کے کام میں لا سکے۔ اگر وہ تجارتی یا صنعتی کاروبار میں لگا ہوا ہے، تو خواندگی کی بدولت اس کام کو فروغ دے سکے۔ اس کام میں بالخصوص صنعتی اداروں کو پہل کرنی چاہیے اور تمام استادوں اور طالب علموں کو بالغوں کی تعلیمی مہم میں یہ سمجھ کر

حصّہ لینا چاہیے کہ یہ سماجی اور قومی خدمت کا کام ہے۔

دیہی علاقوں میں کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جگہ بہ جگہ انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ان میں مذاکرات کا انتظام کیا جاتا ہے تاکہ کسانوں کو غلّے کی اُن اقسام سے روشناس کیا جا سکے جن سے پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔ خواندگی کے پروگرام کو اس کام سے مربوط کیا جاتا ہے۔ چارٹ، کتابیں اور دیگر تعلیمی سامان نیز تعلیمی طریقے سبھی زرعی پیداوار کے عوامل کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ خواندگی کی توسیع کا یہ کام دراصل یونیسکو کے اس تجرباتی منصوبے کا حصّہ ہے جو دنیا کے مختلف ممالک میں ناخواندگی مٹانے کی خاطر عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ہندستان کے ساٹھ اضلاع میں یہ پروجیکٹ ۱۹۷۰-۷۱ء میں چلایا جا رہا تھا۔ اس کے نتائج امید افزا ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کام بہت جلد اُن تمام نٹو اضلاع میں پھیل جائے گا جہاں زیادہ فصل اُگانے کے لیے عمدہ قسم کے بیجوں کا تجربہ کیا جا رہا ہے اور جہاں کسانوں کی ٹریننگ کا ایک باضابطہ پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ ان اضلاع میں خواندگی کی مہم سے نہ صرف کسانوں کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ وہ نئے نئے تجربے کرنے کی طرف بھی مائل ہو رہے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی اور جسمانی صحت کی تعلیم کے ساتھ بھی خواندگی کے کام کو منسلک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا کام بہت پیچیدہ اور مشکل ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے جذباتی، سماجی اور اقتصادی مسائل وابستہ ہیں۔ اسی لیے اس

کام میں نسبتاً کم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی معاونت سے وزارت صحت "آبادی" سے متعلق تعلیم کا ایک ٹھوس پروگرام مرتب کر رہی ہے جو بالغوں کی خواندگی کی اسکیم کا حصہ ہوگی۔

یونیسکو کی مدد سے حکومت ہند نے تعلیم بالغان کا ایک اور تجربہ شروع کیا ہے۔ اس کے لیے ایک ایسی اسکیم مرتب کی کی گئی ہے جس کے تحت صنعتی علاقوں میں تعلیم بالغان کے ہمہ گیر مراکز کھولے جائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ مزدوروں کے لیے عام تعلیم کا التزام کیا جائے اور انھیں پڑھنا لکھنا سکھانے کے علاوہ، پیشہ ورانہ تعلیم اور شہریت کی تعلیم دی جائے۔ نیز ان کی زندگی کے تہذیبی اور جمالیاتی پہلو کو بھی اجاگر کیا جائے۔ اس قسم کا پہلا تعلیمی مرکز ۱۹۶۶ء میں بمبئی میں قائم کیا گیا جسے بمبئی شہر کی سماجی تعلیم کی کمیٹی چلاتی ہے۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں اس تجربے کا جائزہ لینے اور دوسرے ایشیائی ممالک میں اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی غرض سے بمبئی میں ایک ایشیائی علاقائی سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں طے پایا کہ یہ تجربہ دوسرے ممالک کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا اس لیے کہ نہ صرف اس قسم کی مربوط تعلیم سے بالغوں کی عام تعلیمی سطح بلند ہوتی ہے بلکہ اُن کی انفرادی صلاحیت اور کارکردگی بھی فروغ پاتی ہے۔

اسی طرح بعض سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے بالغوں کے اسکول بھی کھولے ہیں۔ بالغ محنت کش اور ملازم پیشہ لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں ان اسکولوں سے فائدہ اٹھاتے

ہیں اور اپنی تعلیمی استعداد بڑھاکر مختلف امتحان پاس کرتے ہیں مثلاً
مڈل اور ہائر سیکنڈری امتحانات۔ بڑے شہروں میں اس قسم کے
پروگرام بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور بہت سے بالغوں نے اپنے
لیے ترقی کے امکانات کو وسیع کیا ہے۔

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، ان کی خواندگی کے لیے ایک خاص
اسکیم چلائی گئی ہے۔ گاؤں کی بالغ عورتیں جو کسی وجہ سے اپنے بچپن
میں تعلیم سے محروم رہیں، ان کی تعلیم کے لیے یہ سہولت فراہم کی گئی
ہے کہ وہ مختصر نصاب تعلیم کو مکمل کرکے پڑھنے لکھنے کی اتنی استعداد
حاصل کرلیں کہ گاؤں کی سطح پر کیے جانے والے ترقیاتی کاموں کے لیے ٹریننگ لے سکیں۔
اس ٹریننگ کے بعد انھیں ملازمت بھی مل جاتی ہے۔ اس طرح ایک
طرف تو ان کی روزی کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے اور دوسرے دیہات
میں ترقیاتی اور توسیعی کام کرنے کے لیے تربیت یافتہ کارکن بھی مہیا
ہوجاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت اٹھارہ سال سے تیس سال عمر تک
کی عورتیں جنھوں نے پہلے سے کچھ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرلی ہے،
دو سال کے اندر مڈل اور ہائی اسکول امتحان پاس کرلیتی ہیں۔ یہ
اسکیم ۱۹۵۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۶۳ء تک بائیس ہزار عورتوں
نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان میں سے بیشتر دیہی علاقے میں
گرام سیویکا، استانی، نرس اور خاندانی منصوبہ بندی کے کارکن
کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہی ہیں۔

تعلیم بالغاں کا ایک اور پہلو ہے جس کا تعلق تعلیم کا سلسلہ
جاری رکھنے سے ہے۔ حال میں تعلیم کے اعلیٰ ترین ادارے یعنی یونیورسٹی

نے ادھر توجہ دی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم بالغان اور مسلسل تعلیم کے شعبے قائم کرنے میں امداد بہم پہنچائے۔ چنانچہ کئی ایک یونیورسٹیوں نے اس قسم کے شعبے قائم کرنے کی تجاویز مرتب کی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مختلف کے پروگراموں میں امداد دے گی۔ مثال کے طور پر پیشہ ورانہ تعلیم، دیہی ترقی سے متعلق کارکنوں کی ٹریننگ، تہذیبی مشاغل، تعلیم بالغان کے کارکنوں کی ٹریننگ اور اس سے متعلق ریسرچ جس میں بالغوں کی خواندگی کے لیے تعلیمی مواد، ذرائع رسل و رسائل اور سماجی تعلیم جیسے پروجیکٹ امداد کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض یونیورسٹیوں نے اپنے طور پر بالغوں کی خواندگی اور تعلیم سے متعلق مختلف قسم کے پروجیکٹ شروع کیے ہیں، جو قومی سماجی خدمات کی اسکیم کے تحت چلائے جاتے ہیں۔

۱۸- بڑھتی ہوئی آبادی اور ناخواندگی

بظاہر یہ ایک پہیلی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کے تمام پچھڑے ہوئے ملکوں میں اَن پڑھوں کو خواندہ بنانے کی مہم چلائی جا رہی ہے اور اس کی بدولت پڑھے لکھے لوگوں کا فی صد بڑھ رہا ہے، مگر اَن پڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے ملک ہندستان کو لیجیے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دیس میں کوئی چوبیس فی صد پڑھے لکھے لوگ تھے، ۱۹۷۱ء میں یعنی دس سال بعد پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً انتیس فی صد ہو گئی، لیکن اَن پڑھوں کی تعداد گھٹنے کے بجائے بڑھ گئی۔ ۱۹۶۱ء میں ہندستان میں تینتیس کروڑ اَن پڑھ تھے، اس کے مقابلے میں ۱۹۷۱ء میں اَن پڑھوں کی تعداد اڑتیس کروڑ ہو گئی، یعنی پچھلے دس سال میں پانچ کروڑ اَن پڑھ اور زیادہ ہو گئے۔ عجیب گورکھ دھندا سا لگتا ہے۔ مگر یہ کوئی معمّا نہیں، سیدھی سی بات ہے، ہماری

آبادی اور خواندگی کے پروگرام کے بیچ آنکھ مچولی کا کھیل ہو رہا ہے، آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کی ہماری تمام کوششیں آبادی کی لگاتار بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواندگی کی مہم کے باوجود اَن پڑھوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے دیس کو ناخواندگی سے کبھی چھٹکارا نہ دلا سکیں گے اور تمام لوگوں کو کبھی بھی تعلیم یافتہ نہ بنا سکیں گے۔ آج کی دنیا میں تعلیم ترقی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ہماری حالت بہت افسوس ناک معلوم ہوتی ہے۔

مگر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر تعلیم کا کسی ملک کی ترقی سے کیا تعلق ہے۔ کیا ناخواندہ آبادی اپنی محنت و مشقت سے ملک کو دولت مند نہیں بنا سکتی؟ بعض لوگ تعلیم کو ایک آرائشی چیز سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ قومی دولت بڑھانے کے لیے ملک کے تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جب پیداواری طور و طریق سیدھے سادے تھے تو کام کرنے والے کے لیے چنداں ضروری نہیں تھا کہ وہ پڑھے لکھے ہوں۔ چاہے کھیتی باڑی کا کام ہو یا گھریلو دستکاری، اس میں شرکت کر کے سیکھنے والا کام کرنے کے گُر معلوم کر لیتا تھا اور مشق کے ذریعے اسے مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ مگر آج کے مشینی دور میں یہ ممکن نہیں۔ اب ہر ایک پیداواری عمل اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اُسے خواندگی کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ

سماج کو صحیح معنوں میں جمہوری اور سوشلسٹ شکل دینے کے لیے ضروری ہے کہ جنتا اپنے حقوق و فرائض سے باخبر ہو اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب سب کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔ موجودہ زمانے میں کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی تعلیم کا انتظام نہ کرے۔ صرف اسی حالت میں ہر ایک شخص اپنی پیدائشی قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھار سکتا ہے۔ اس لیے تمام لوگوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس سے ایک طرف فرد کی ذاتی زندگی مادی اور تہذیبی دونوں اعتبار سے مالا مال ہوگی اور دوسری طرف ملک بھی ترقی کرے گا۔

آئیے اب ذرا دیکھیں کہ ملک کے تمام لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہمارے پاس ایسے سادھن نہیں کہ اتنا بڑا کام پورا کر سکیں۔ مگر ہم نے اسے اپنا ایک قومی مقصد قرار دیا ہے۔ ہمارے ملک کے دستور اساسی کی دفعہ ۴۵ میں ہدایت کی گئی ہے کہ ریاست کا فرض ہے کہ قوم کے تمام بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام چودہ سال کی عمر تک کرے۔ اس دفعہ کے مطابق ۱۹۶۰ء تک یہ مقصد حاصل ہو جانا چاہیے تھا مگر کوشش کے باوجود یہ اب تک ممکن نہ ہو سکا۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہمارے دیس میں چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے جتنے بچے ہیں، ان کی لگ بھگ آدھی تعداد کے لیے ہی تعلیم کا انتظام کیا جا سکا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً چھ کروڑ بچے ایسے ہیں جنھیں آج تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ ہماری آزادی میں اتنی تیز رفتاری سے

اضافہ ہوا ہے کہ جب تک ہم ان تعلیم سے محروم چھ کروڑ بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کر سکیں گے، اس وقت تک یہ تعداد اور زیادہ ہو جائے گی۔ غرض اس مسئلے کا حل بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نہ صرف تعلیمی بلکہ مالی لحاظ سے بھی غیر معمولی رفتار سے بڑھتی ہوئی آبادی ہندستان کی قومی ترقی پر بہت برا اثر ڈال رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد شرح پیدائش میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن موت کی شرح، بہتر غذا اور طبّی سہولتوں کی بدولت خاصی کم ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس مدت کے دوران آبادی بہت تیزی سے بڑھی ہے۔ ادھر چند سال سے خاندانی منصوبہ بندی کی مہم چلائی جا رہی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جنتا میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ چھوٹا خاندان خوش حالی کا نشان ہے۔ میاں بیوی کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ دو تین سے زیادہ بچے پیدا نہ کریں۔ دراصل خاندانی منصوبہ بندی کا کام ایک تعلیمی کام ہے۔ اگر لوگوں کو یہ احساس ہو جائے کہ کم اولاد ہونا ان کے لیے ذاتی طور پر بھی فائدہ مند ہے اور پورے ملک کے لیے بھی، تو سمجھیے کہ آدھی لڑائی جیت لی۔ پوری کامیابی حاصل کرنے کے لیے پھر صرف اتنی بات رہ جائے گی کہ ضبط تولید کے جو آزمودہ طریقے تجویز کیے جائیں، انھیں برتا جائے۔

یوں تو ہمارے دیس میں کافی عرصے سے خاندانی منصوبہ بندی کا چرچا ہے۔ جہاں جائیے اس کے بارے میں طرح طرح کے اشتہار نظر آتے ہیں جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جگہ جگہ خاندانی

منصوبہ بندی کے مرکز قائم کیے گیے ہیں جہاں واقف کار عملہ تکنیکی صلاح
و مشورہ دیتا ہے اور عملی کارروائی بھی کرتا ہے۔ مگر اب تک ان تمام
کوششوں کا نتیجہ خاطر خواہ نہیں ہوا۔ اس دیس میں مالی لحاظ سے
جو سب سے نچلا طبقہ ہے اور جس میں ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ
شامل ہے، خاندانی منصوبہ بندی سے بہت کم متاثر ہوا ہے۔ یہ وہ طبقہ
ہے جس میں بیشتر لوگ اَن پڑھ اور طرح طرح کے توہمات میں گرفتار
ہیں۔ اس وجہ سے وہ چھوٹا خاندان رکھنے کی کوئی عملی تدبیر کرنے
سے ہچکچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہتیروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اولاد
خدا یا پرماتما کی دین ہے۔ اس لیے اگر اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو
ضرور غیبی مصیبت نازل ہوگی۔ آخر اللہ کی مرضی میں کسے دخل دینے
کی مجال ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دو تین بچوں کو اس لیے کافی
نہیں سمجھتے کہ اگر یہ بچے اور خاص طور پر لڑکے ان کے مرنے سے پہلے ہی
چل بسے تو اُن کا کریا کرم کون کرے گا۔ اور اس صورت میں ان کی آتما
کو شانتی کیسے نصیب ہوگی! اس کے برعکس اگر اولاد زیادہ ہو
تو اس قسم کے حادثے کا امکان کم ہے۔ جو بہت غریب ہیں، محنت
مزدوری کر کے اپنے خاندان کا گزارا کرتے ہیں، ان کا خیال ہے
کہ جتنی زیادہ اولاد ہوگی، اسی قدر انھیں اپنے کنبے کی پرورش میں
مدد ملے گی، اس لیے کہ مزدوروں کے آٹھ نو سال کے بچے بھی محنت
و مشقت سے کچھ نہ کچھ ضرور کما لیتے ہیں۔ یہ بات کھیت مزدور اور
کارخانے کے مزدور دونوں کے نزدیک صحیح ہے۔ اسی طرح جو لوگ
خود کاشت کار ہیں، اُن کی اپنی زمین ہے وہ بھی زیادہ اولاد کے

حق میں ہیں، کیونکہ کھیتی باڑی کے پرانے طریقے ایسے ہیں جن میں بیک وقت بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اپنی اولاد ہی کے بل بوتے پر کھیتی کا ڈھرا ٹھیک طرح چل سکتا ہے۔ گانو میں بعض لوگ اس خیال کے بھی ہیں کہ بڑا کنبہ طاقت اور عزت کی نشانی ہے۔ اس صورت میں کوئی شخص انھیں دبا نہیں سکتا، دوسرے لوگوں پر اُن کا رعب پڑتا ہے۔ غرض، اس قسم کے عقیدے اور خیالات خاندانی منصوبہ بندی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

اس لیے اگر ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول کرنا ہے کہ وہ مناسب حدود کے اندر رہے، تو دو ضروری باتیں ساتھ ساتھ کرنی پڑیں گی۔ ایک تو یہ کہ جنتا میں اولاد کی کثرت سے متعلق جو توہم پرستی اور غلط فہمی جڑ پکڑے ہوئے ہے اُسے ختم کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر مسلسل تعلیمی مہم چلانی ہوگی۔ اس معاملے میں ریڈیو اور چلتے پھرتے سینما ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں کہانی، ڈراما اور تصویر کا بھی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے آبادی کے نادار اور کمزور طبقے کی مادی زندگی کو بہتر بنانا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خاص کر اس طبقے کے لیے منافع بخش کام مستقل طور پر مہیا کیا جائے، تاکہ یہ سوچنے کی وجہ باقی نہ رہے کہ خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے اولاد کی کثرت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کرنا چاہیے کہ ان بچوں کو کھیت اور کارخانے میں محنت مزدوری کرنے کی قانوناً ممانعت کر دی جائے جو عمر کے اعتبار سے لازمی تعلیم کے دائرے میں آتے ہوں۔ اور ان کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کی جائیں

کہ مدرسہ ان کے لیے کشش کی جگہ بن جائے۔ مثلاً مدرسے میں ان بچوں کو یونیفارم، دوپہر کا کھانا، کتابیں اور دیگر تعلیمی سامان مفت دیا جائے۔ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ حکومت نے اس سمت میں قدم اُٹھایا ہے۔ نچلے طبقے کو موجودہ پلان میں روزگار مہیا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مسئلے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے یہ کوشش بہت ناکافی ہے۔ اس طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بعض علاقوں میں حاجت مند بچوں کو مدرسے کے اندر وہ سہولتیں دی جانے لگی ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پروگرام کو تمام ملک میں پھیلایا جائے۔ اس سلسلے میں ایک چیز قابلِ ذکر ہے وہ ہے، بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم میں آبادی کے مسائل کو شامل کرنے کی تجویز جسے Population Education کا نام دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مدرسے کے مختلف مضامین کے ذریعے انھیں ان مسائل سے آگاہ کیا جائے جو آبادی کے اضافے سے پیدا ہوتے ہیں تاکہ آیندہ نسل ملک کی آبادی کو کنٹرول کرنے میں مدد دے سکے۔ اور ملک کو ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

حصہ پنجم

چند تعلیمی مسائل

۱۹۔ جذباتی ہم آہنگی

"کیوں، لالہ جی آج تمھاری دکان پر چہل نہیں آئے گا؟" گاہک نے پوچھا۔ لالہ جی نے بہت فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "بھئی اصل معاملہ یہ ہے کہ پاکستان میں تو مسلمانوں کی حکومت ہے ہی، ہندستان میں بھی مسلمان ہی کی حکومت ہے۔"

یہ جواب بظاہر ایک معمّا معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کیجیے تو اس کے اندر منافرت کا دیو چھپا ہوا ملے گا۔ ہوا یہ کہ ایک دن دہلی کی سبزی منڈی میں یکایک ہندو مسلم فساد ہو گیا، حکومت نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب چند بڑے شرنارتھی دکان دار تھے، چنانچہ ان پر بطور سزا جرمانہ کیا گیا، انھوں نے احتجاجاً دو ایک دن منڈی میں ہڑتال جاری رکھی۔ لالہ جی کی دکان پر چہل نہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی۔

لالہ جی بذات خود بہت سیدھے سادے آدمی ہیں، مغربی پنجاب میں ملک کی تقسیم سے پہلے بھی یہی کاروبار کرتے تھے، بظاہر انھیں سیاست کاری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات قرین، قیاس نہیں معلوم

ہوتی کہ مذکورہ بالا جواب خود لالہ جی کے ذہن کی پیداوار ہے، یا یہ ان کا ذاتی خیال ہے، یہ جملہ تو کسی سیاسی شعبدہ باز کا معلوم ہوتا ہے اور اس کی تہہ میں بہت کچھ ہے۔

یوں تو فرقہ وارانہ منافرت ہمارے دیس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور ہمارے دیس ہی پر کیا مخصوص ہے دنیا دوسرے دیسوں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، لیکن تقسیم ہند کے بعد اس کی نوعیت میں تبدیلی ضرور ہو گئی ہے، ہمارے لیے یہ بہت اہم ہے کہ ہم اس کی حقیقت سے واقف ہوں اور اس کے بعد اس کا سدّباب کرنے کی جدوجہد کریں، ورنہ یہ چیز جنتا راج قائم کرنے کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرے گی۔

اس مسئلے کو سمجھنے، سمجھانے اور حل کرنے کی مختلف کوششیں پچھلے زمانے میں کی گئی ہیں اور آج بھی کی جا رہی ہیں، اس میدان میں ہمارے قومی کارکن، مذہبی مبلغ، سماجی اور تعلیمی کام کرنے والے ماہرینِ نفسیات غرض ہر قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں پہلے فکر و عمل کے ان مختلف طریقوں کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ کہاں تک اصل مسئلے کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور پھر اس کے حقیقی اسباب کا ذکر کیا جائے گا اور آخر میں راہِ عمل کی نشان دہی کی جائے گی۔

آیئے، سب سے پہلے اس مسئلے سے متعلق ان توجیہات کا جائزہ لیں جو علم نفسیات کی روشنی میں پیش کی جاتی ہیں، اس معاملے میں خاص طور پر فرائڈ کے پیرووں کا، بہت دخل ہے، ان کے خیال

کے مطابق فرقہ وارانہ منافرت، دراصل فرد کے احساس جرم کا مظہر ہے یعنی ہم دوسروں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ واقعی ہم خود اپنے کو مجرم سمجھتے ہیں، لیکن ہم اس کی ذمّے داری سے بچنے اور اپنے دل کو ہلکا کرنے کے لیے اپنا جرم دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں، نفسیات کی اصطلاح میں اس عمل کو Projection کہتے ہیں، گویا ہم اپنی خطا دوسروں کے سر غیر شعوری طور پر منڈھ دیتے ہیں اور اپنی ذات کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم خود بے گناہ ہیں۔

فرائڈ کے بعض نام لیواؤں نے اس نظریے میں ایک اور گرہ لگائی ہے، ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنے خاندان کی طرف نفرت کا جذبہ لے کر پیدا ہوتا ہے جس کی تہہ میں جنسی رقابت کارفرما ہوتی اور چونکہ انسان سماجی قیود کی وجہ سے اس منافرت کا اظہار اپنے خاندان کے لوگوں کے خلاف تو کر نہیں سکتا اس لیے یہ جذبہ غیر شعوری طور پر غیروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یعنی اس نظریے کے مطابق ہم دوسروں کے ساتھ منافرت کرنے پر مجبور ہیں، اور اس لیے اگر ہمارے ہاں اس منافرت نے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی ہے تو یہ کوئی غیر فطری یا بے جا بات نہیں ہے کیونکہ منافرت کے اس پیدائشی جذبے کو آخر کسی نہ کسی روپ میں تو ظاہر ہونا ہی تھا! اس عمل کے لیے ان ماہرین نے جو اصطلاح گڑھی ہے اسے Displace-ment کہتے ہیں۔ اگر ہم منافرت کی اس توجیہہ کو مان لیں تو پھر جو کچھ ہمارے دیس میں بٹوارے کے بعد ہوا جس کی انسانیت سوز واقعات کی یاد آج بھی ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے، اس پر ہمیں

یہ سمجھ کر مطمئن ہو جانا چاہیے کہ یہ امر فطری تھا، اور پھر ظالم اور مظلوم میں تمیز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، ظالم کے خلاف نفرت اور غصے کا جذبہ پیدا ہونے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس صورت میں ظلم و تشدد کے خلاف جدوجہد کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی۔

نہ صرف یہ نفسیاتی نظریے سائنٹیفک نقطۂ نظر سے مہمل ہیں اور انسانی فطرت کو غلط انداز میں پیش کرتے ہیں بلکہ ان کی بدولت ہم رجعت پسندی کے دور میں جا گرتے ہیں کیونکہ وہ بے عملی کی تلقین کرتے ہیں اور موجودہ صورت حال کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ ظالم کی پشت پناہی کرتے ہیں اور مظلوم کا گلا دباتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریے اس وجہ سے کسی ایسے شخص کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتے جس کو انسانیت کے روشن مستقبل میں بھروسا ہے اور جو یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ انسان بھی جنگل کے قانون یعنی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

آیئے اب ذرا ان لوگوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اپنے کو عمرانیات کا طالب علم یا سماج سدھارک سمجھتے ہیں۔ اس حلقے میں ہمیں مختلف قسم کے لوگوں سے بھینٹ ہوتی ہے اس میں سیاسی لیڈر بھی نظر آتے ہیں اور سماجی مصلح بھی۔ مذہبی رہنما بھی دکھائی دیتے ہیں اور تہذیبی کارکن بھی مثلاً معلمین، ادیب، فلسفی وغیرہ۔ یہ حضرات بھی عام طور پر فرقہ وارانہ منافرت کی پوری ذمے داری قومی اور مذہبی تعصبات پر ہی ڈالتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق مختلف

مذاہب اور اقوام کے پیرو ایک دوسرے سے اسی لیے نفرت کرتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب اور قوم کو سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمان کا ایمان ہے کہ صرف اس کا مذہب ہی ایک مکمل دین ہے اور دوسرے مذاہب فقط زمانہ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ یا ہندو کا عقیدہ ہے کہ اس کا مذہب قدیم ترین دھرم ہے اور اس کے تمدن یا سنسکرتی سے دنیا کا اور کوئی تمدن ٹکر نہیں لے سکتا۔ یہ مذہبی تعصب نفرت کا بیج بوتا ہے جس کی آبیاری خود غرض مذہبی لیڈر کرتے ہیں اور وہ بڑھ کر اتنی مہیب جھاڑی بن جاتی ہے کہ وہ زندگی کے نوزاد پودوں کو روشنی اور کھلی ہوا سے محروم کر کے برباد کر دیتی ہے۔

اس نظریے کی تہہ میں یہ مفروضہ پوشیدہ ہے کہ ہندوستانی لوگ غیر معمولی طور پر مذہبی خبط و جنون کے شکار ہیں۔ گویا مذہب کا نشہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اور ان کی جڑیں روایتی مذہب میں مضبوطی کے ساتھ پیوست ہیں، اسی لیے بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کے مذہبی عقائد میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں شاید یہ بے محل نہ ہوگا کہ یہاں رسالہ "ٹائم" نیو یارک کے اس خاص مضمون کا حوالہ دیا جائے جو اس میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کے متعلق شایع ہوا تھا۔ اس پرچے کے کور پر کالی دیوی کی ایک نہایت ڈراؤنی تصویر تھی جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ وہ کس قدر سفاک اور وحشی ہے کہ جس کے متعدد ہاتھوں اور پیروں میں انسانی جسم کے مختلف حصے آویزاں

ہیں اور اندر مضمون کے ساتھ میں ایک تصویر میں حضرت محمدؐ اور اُن کے ساتھیوں کو ہاتھ میں ننگی تلواریں لیے ہوئے دکھایا گیا تھا کہ وہ کسی غارت گری کی مہم پر جا رہے ہیں۔ اس مضمون میں ان توضیحات کی مدد سے یہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندومت اور مذہب اسلام کی بنیاد کشت وخون کی روایات پر قائم ہے، لہٰذا یہ فسادات جن میں انسان گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے اور انسان نے ایسی وحشیانہ لذتیت کا ثبوت دیا کہ جس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

"ٹائم" کے مضمون نگار کا یہ خیال اس خیال کی کچھ بگڑی ہوئی اور ذرا شدید سی شکل ہے جس کے حامی بہت سے ہمارے قومی رہنما اور مفکرین بھی ہیں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ آیئے اب ذرا اس پر بھی غور کریں کہ ہمارے ان رہنماؤں اور مفکرین کے نزدیک اس مسئلے کا حل کیا ہے۔

بعض حضرات یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مذہبی اختلافات کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ اقلیتوں کے مذاہب کو اکثریت کا مذہب اپنے اندر اس طرح جذب کر لے کہ ان کے انفرادی نقوش نظر نہ آئیں یعنی سب کا ایک ہی مذہب ہو جائے۔ اس گروہ میں بعض نام نہاد انقلاب پسند افراد اور اقلیتوں کے لیڈر بھی شامل ہیں جو "اسلام" کو عین ہندوستانی بنانے کی تلقین کرتے ہیں، یہ لوگ اس کے لیے بظاہر بہت معقول دلیل پیش کرتے ہیں، وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قومی اتحاد اور ایکے کو مضبوط اور پختہ بنانے کے

لیے مذہبی اختلافات کا قلع قمع کرنا ناگزیر ہے۔

لیکن ذرا کرید کر دیکھیے تو قومی اتحاد کے اس نعرے کی تہہ میں بدترین تعصب، مذہبی اور نسلی برتری کا غرور یا غایت درجے کی موقع پرستی نظر آئے گی۔ اتحاد کوئی شکنجے کی مدد سے پیدا کرنے کی چیز نہیں ہے کہ مختلف چیزوں کو دبا کر ایک کر دیا جائے، حقیقی اتحاد تو مختلف اجزا کے اپنی خوشی سے ملنے کا نتیجہ ہوتا ہے، جس میں باہر سے کوئی دباؤ یا جبر کارفرما نہیں ہوتا۔

یہ لوگ صرف مذہب ہی کے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتے، بلکہ ان کے نزدیک تہذیب اور کلچر کے تمام امتیازات کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ جس چیز کو اکثریت کا کلچر سمجھتے ہیں اس کو سب پر زبردستی مسلط کر دیا جائے، چنانچہ زبان کے مسئلے میں یہ خیال نہ صرف نہایت بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا بلکہ اسے شمالی ہند میں عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا ہے۔

دوسرا گروہ ان بزرگوں کا ہے، جو مذہبی رواداری کے اصول پر دوسرے مذہبوں اور تہذیبوں کی "اچھی اچھی" چیزوں کو اپنانے کی تبلیغ کرتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق مختلف اجزا کو سمو کر ایک کرنے کے عمل میں ہر جز کی امتیازی شان قائم رہنی چاہیے، یہ وہی حضرات ہیں جو سیاسی مسئلے کا حل فرقوں کی تناسبی نمائندگی میں تلاش کرتے ہیں، وہ تہذیبی مسئلوں کو بھی اسی اصول کی بنا پر سلجھانا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُردو اور ہندی کے مسئلے کا حل ان کے نزدیک "ہندستانی" ہے جس میں اُردو اور ہندی دونوں

کے الفاظ ہونے چاہییں، گاندھی جی اس نظریے کے سب سے بڑے مبلغ تھے، انھوں نے اپنے طور پر اس کو ایک عملی شکل بھی دینے کی کوشش کی تھی، آپ نے ان کی مشہور دعا جو انھیں بہت محبوب تھی یعنی "رام دھن" سنی ہوگی اس میں ایک مصرع ہے کہ

ایشور اللہ تیرے نام

گویا ان حضرات کے نزدیک مذہبی اختلافات اور ان کی بنیاد پر فرقہ وارانہ تعصبات اور منافرت کا حل "آخر کار مذہب" ہی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ حل اب تک قومی زندگی کے کسی شعبے میں بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا ہے، سیاسی میدان میں اس خیال کے مطابق پچھلے زمانے میں جو کوششیں کی گئیں وہ اُلٹی ڈھول کو کھانے کی مصداق بنی ہیں اور اب جو تہذیبی دائرے میں عملاً ہو رہا ہے اس کا نتیجہ بھی مایوس کن ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں فرقہ وارانہ منافرت کی جڑوں کو تلاش کرنے کے لیے ذرا گہرا کھودنا پڑے گا۔ صرف اس سے کام نہیں چلے گا کہ اس منافرت کے مظاہر یعنی جو شکلیں یہ اختیار کرتی ہے، انھیں پہچان لیا جائے ——— یہ شکلیں تو بہت صاف نظر آتی ہیں ——— بلکہ اس کے بنیادی اسباب کو سمجھنا ازبس ضروری ہے، علامات اور اصل مرض میں ہمیں تمیز کرنی ہوگی، علامات پر اکثر مرض کا دھوکا ہو جاتا ہے اور ہم انھیں ہی مرض سمجھ کر علاج کی تدابیر کرنے لگتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس دھوکے سے ہمیں بچنا چاہیے۔

پہلی بات اس سلسلے میں ہمیں یہ معلوم ہونی چاہیے کہ ہمارا موجود سماج جن بیماریوں میں مبتلا ہے، ان میں سے فرقہ وارانہ نفرت صرف ایک بیماری ہے، مفلسی، بھوک، بے روزگاری، جہالت وغیرہ بیماریاں اتنی ہی عام ہیں جتنی کہ فرقہ وارانہ منافرت اور ان تمام بیماریوں کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے، اس لیے سوال کسی ایک بیماری کے علاج کا نہیں ہے، بلکہ ہمیں ان سبھی کا مقابلہ کرنا ہے۔

یہ تمام امراض اپنے آخری تجزیے میں ہمارے سماج کے موجودہ ڈھانچے کی پیداوار ہیں، سماج کا یہ ڈھانچہ کیا ہے؟ طبقاتی یعنی ہمارا سماج دو متضاد طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جس کے قبضے میں پیداوار کے ذرائع و وسائل ہیں، یعنی یہ لوگ زمین اور کارخانوں کے مالک ہیں، زمیندار اور سرمایہ دار۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ دوسرا طبقہ محنت کش لوگوں پر مشتمل ہے جو سماجی ضرورت کی تمام چیزیں اپنا خون پسینہ ایک کرکے پیدا کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ ذرائع پیداوار کے مالک نہیں ہیں، اس لیے ان کی محنت کا پھل انھیں نہیں ملتا بلکہ اس کو وہ طبقہ ہڑپ کرلیتا ہے جو ان ذرائع و وسائل پر قابض ہے اس طرح ہمارے سماج کا محنت کش طبقہ جس کی بہت بڑی اکثریت ہے باوجود محنت مشقت کے محتاج اور نادار ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں طبقوں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اس وجہ سے سماج میں ایک مستقل کش مکش جاری ہے، ناداروں کا طبقہ اپنی حالت سدھارنے کے لیے جب جماعتی

خود پر جدوجہد کرتا ہے اور جب اس کے طبقاتی شعور کے ساتھ ساتھ اس میں تنظیم پیدا ہوتی ہے تو استحصال کرنے والا طبقہ "شوکنگ" طبقہ لرزنے لگتا ہے اور وہ اپنے وجود اور مفاد کو برقرار رکھنے کے لیے نادار "شوریشت" طبقہ کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، وہ نہ صرف انھیں منظم تشدد کی ہولناک قوتوں سے کچلتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی صفوں میں پھوٹ کے بیج بوتا ہے، وہ انھیں اصل مسئلے سے بھٹکانے کے لیے ان کے راستے میں بہت سی بھول بھلیاں پیدا کرتا ہے وہ ان کی توجہ کو جذباتی جادو کے ذریعے اصل جدوجہد سے ہٹا کر انھیں ایسی باتوں میں اُلجھا دیتا ہے کہ ان کے حملے کا رُخ اس کی طرف ہونے کے بجائے خود انہی کے ساتھیوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ شوکنگ طبقے کو اپنے اس مقصد کے پورا کرنے میں تعلیم و تربیت، اطلاع اور اشاعت کے تمام ذرائع سے مدد ملتی ہے اس لیے کہ ان پر بھی اسی طبقے کا قبضہ ہوتا ہے۔ ہمارے مدرسے، اور کتب خانے، ریڈیو اور اخبار، سینما اور تھیٹر، غرض تمام ذرائع علم و معلومات اسی طبقے کا اُلّو سیدھا کرنے کے کام آتے ہیں۔ ادیب، فن کار اور معلم سبھی اس مہم میں خدمات انجام دیتے ہیں جب کہ اتنے ہوشیار اور چابک دست جادوگر ایک طرف موجود ہوں تو بھلا شوریشت طبقہ اثر قبول کیے بغیر کیسے بچ سکتا ہے۔

شوریشت طبقے کا شعور جتنا تیز ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی جدوجہد میں تندی اور تیکھا پن، گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، چنانچہ ہمارے دیس میں پچھلے پچاس سال میں یہ طبقاتی شعور

پیداوار بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طبقاتی جدوجہد میں ترقی ہوئی ہے برطانوی سامراج کے خلاف جو جنگ پچھلے زمانے میں لڑی گئی اس کی تہہ میں بھی یہی چیز کارفرما تھی، اس کے علاوہ آزادی سے پہلے اور بعد ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں معرکے ہماری تاریخ کے اوراق کو روشن کر چکے ہیں، جن میں طبقاتی جدوجہد براہ راست اور صاف صاف نظر آتی ہے کبھی یہ مورچے کسانوں نے زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں لگائے تو کبھی مزدوروں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے قائم کیے اور کبھی متوسط طبقے کے لوگوں اور طالب علموں نے بے روزگاری کے خلاف اور تہذیبی سہولتوں کو حاصل کرنے کے لیے، غرض اس جدوجہد کی شکلیں مختلف رہی ہیں لیکن ان کی اصل ایک ہے، یعنی وہ سب طبقاتی کش مکش کی مظہر ہیں ان کی بڑھتی ہوئی قوت، شوشک طبقے کے لیے لازمی طور پر بے چینی کا باعث ہے، آج اس طاقت کو محض آہن و آتش کے بل بوتے پر ختم نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ ایک طرف شوشک طبقے کے داخلی تضاد اسے کمزور کر رہے ہیں اور اس کا سنکٹ دن بدن نمایاں ہوتا جا رہا ہے، دوسری طرف اس کے خلاف لڑنے والی قوتیں زیادہ منظم اور طاقت ور ہوتی ہیں اور پھر شوشک طبقے کو آخر اپنی جمہوریت کا بھرم بھی کسی حد تک قائم رکھنا ہے تاکہ اس کی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کے لیے اخلاقی طور پر صورت جواز قائم رہے، اس بدحواس کر دینے والی صورت حال میں شوشک طبقہ ہمارے دیس میں بھی ان ہی حکمت عملیوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کو کام میں لانے کی کوشش

کر رہا ہے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں اس کے بھائی بندوں کے حق میں مفید ثابت ہو چکے ہیں۔

اس حکمت عملی کی نہایت ہی گھناؤنی اور مہیب شکل ہٹلری فاشسزم کی یہود دشمنی میں ملتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ اور خاص طور پر جرمنی کی جو حالت ہو گئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر ہٹلر نے جرمن قوم کے سامنے ترقی کا ایک سیدھا سادہ نسخہ پیش کیا کہ یہودیوں کو ختم کر دو کیونکہ جب تک یہ رہیں گے جرمن قوم ترقی نہیں کر سکے گی، چنانچہ یہودیوں کا قتل عام شروع ہوا، لیکن اس کے پردے میں دراصل ہٹلر کے ساتھیوں کو تو مزدوروں کی تنظیموں کو توڑنا مقصود تھا۔ اس لیے انھوں نے یہودیوں کا صفایا کرنے ہی پر بس نہیں کی بلکہ انھوں نے مزدور جماعت اور اس کے ساتھ ساتھ تمام دوسری ترقی پسند جماعتوں اور انجمنوں کا خاتمہ کر دیا، جن میں بعض خالص کلچرل ادارے اور انجمنیں بھی شامل ہیں انھوں نے یہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ انھیں اپنے طبقے کے مفاد کو ترقی دینے کے لیے یہی ذریعہ بہتر اور قابل عمل نظر آیا۔

اس قسم کی دوسری مثال امریکہ کی ہے، جہاں جمہوریت کے نام لیوا آئے دن دنیا کے مختلف ملکوں میں جمہوریت کی حفاظت کے لیے اپنے نیک ارادوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں، ان کے جمہوریت نواز دیس میں قربانی کا بکرا نیگرو ہے اور کسی حد تک یہودی بھی۔ مزدوروں کی یونینوں کو توڑنے میں انھیں نیگرو دشمنی کا جذبہ بہت مدد دیتا ہے، اس بنا پر وہ سفید اور کالے مزدوروں کے درمیان پھوٹ

پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں اور اس طرح شوشک طبقہ
اپنی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر بے کھٹکے عمل کر سکتا ہے۔ بعض کارخانوں
میں یہ طریقہ اتنی صفائی سے استعمال کیا جاتا ہے کہ جس کی مثال اور کہیں
مشکل سے ملے گی۔ مثلاً جہاں سفید مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی
ہے وہاں ہڑتالیں توڑنے کے لیے نیگرو ملازم رکھے جاتے ہیں تاکہ مزدور
طبقے میں نیگرو دشمنی کا جذبہ اور مضبوط ہو جائے۔ اس کا نتیجہ نیگرو کے
لنچنگ یعنی قتل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے دیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ یہاں
رنگ اور نسل کے امتیاز کے بجائے مذہب کے اختلافات اور فرق کو
شوشت طبقے کی تقسیم کا ذریعہ بنایا گیا ہے اس لیے کہ اس ملک کے موجودہ
حالات میں یہ حربہ سب سے زیادہ قابل عمل اور کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔
مسلمانوں کے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے نے ہندوؤں کے متعلقہ طبقے کے
مقابلے میں آنے کے لیے سمجھا کہ آسان ترین زینہ مذہبی منافرت پیدا کر کے
مسلم عوام کو ہندو عوام کے خلاف بھڑکانا ہے اور "اسلام خطرے میں" کا
نعرہ بلند کیا اور آج جبکہ پاکستان بن چکا ہے ہندوستان میں ہندو عوام کے
دل و دماغ کو زہر آلود کرنے میں اسی قسم کے لوگ پیش پیش ہیں۔ بہت
سی فرقہ وارانہ تحریکیں ان ہی عناصر کی رہین منت ہیں۔

ہندو عوام اور مسلم عوام بلکہ تمام جنتا کے مفاد یکساں ہیں۔ ان کے
مقاصد میں ٹکراؤ کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ سب ایک طرف ہیں اور ان کے
مقابل وہ طبقہ ہے جو ان کا خون چوستا ہے، شوشن کرتا ہے۔ اس طبقے
کے خلاف تمام شوشت طبقے کو بلا امتیاز رنگ و نسل یا مذہب منظم ہونا ہے۔

اور اپنے مطالبات کے لیے کندھے سے کندھا ملا کر چلتا ہے اور خود اقتدار اعلیٰ حاصل کرتا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ شوشلسٹ طبقے کو بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے لیے تنظیم کی ضرورت ہے اور یہ ہو بھی رہا ہے۔ باوجود کہ طرح طرح کی رکاوٹیں عوامی تنظیم کے راستے میں ڈالی جارہی ہیں لیکن یہ کارواں، رواں دواں آگے بڑھ رہا ہے۔ سوشلزم کی طرف کیونکہ تاریخ اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ مذہبی، نسلی اور ہر قسم کی منافرت کا ناسور صرف اسی وقت بھر سکے گا جب یہ کارواں اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اس کام میں ہماری آپ کی اور سب کی مدد کی ضرورت ہے اس میدان میں مدرسہ اور دوسرے ذرائع تعلیم اور وسائل اطلاعات کا اہم رول ہے۔ پھر اس قسم کا شرارت آمیز پروپگنڈا کرنے والا کوئی نہ ہوگا کہ "پاکستان میں تو مسلمان کی حکومت ہے ہی، ہندستان میں بھی مسلمان ہی کی حکومت ہے۔"

۲۰۔ لسانی اقلیتوں کی تعلیم

تعلیم کا مقصد ہے فرد کی مکمل نشو و نما کرنا، اس کے شعور اور احساس کو نکھارنا اور اس میں دردمندی کی صفت پیدا کرنا۔ غرض تعلیم فرد کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ عرصے سے تعلیم کا یہی منصب سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن حال میں تعلیم کی غرض و غایت میں ایک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اب تعلیم کے احاطے کے اندر فرد کے علاوہ جماعت بھی آگئی ہے۔ چنانچہ اب تعلیم کو قومی ترقی کے لیے ایک آلۂ کار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ قومی ترقی ایک ایسا نصب العین ہے جس میں انسانی اور مادی دونوں قسم کے وسائل کو فروغ دینا شامل ہے، اور یہ بات ٹھیک ہی ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں پیداوار کی کسی بھی صنعت کو ترقی دینے کے لیے مخصوص علم و ہنر اور استعداد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس علم و ہنر اور استعداد کو حاصل کیے بغیر کسی ملک کے مادی وسائل میں توسیع نہیں ہو سکتی۔ مزید، یہ بات مسلّم ہے کہ علم و ہنر اور استعداد کو بھی قومی مفاد میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ لوگوں میں قومی فلاح

و بہبود کی طرف صحیح رجحان نہ ہو یا ان میں سماجی احساس موجود نہ ہو۔
لہٰذا تعلیم کا کام یہ ہے کہ ایک طرف تو پیداوار بڑھانے کے لیے
لوگوں کو ضروری علم و ہنر اور استعداد بہم پہنچائے اور دوسری
طرف ان میں ایسا رجحان اور سماجی احساس پیدا کرے کہ وہ اپنی
صلاحیتوں کو قومی ترقی کے لیے بروئے کار لانے پر مائل ہوں۔

اگر کسی سماج میں قومی ترقی کا شعور نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ
وہاں تعلیمی مواقع صرف چند منتخب افراد کے لیے ہی فراہم کیے جائیں۔
ایسے سماج میں ایک چھوٹا سا طبقہ جو پہلے ہی سے ایک ممتاز حیثیت
رکھتا ہے تمام تعلیمی سہولتوں کا اجارہ دار بن جاتا ہے اور تعلیم کی
بدولت، یہ طبقہ اپنے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مرتبے کو صرف
قائم ہی نہیں رکھتا، بلکہ اس کو اور پائیدار بناتا ہے ایسے معاشرے
میں اکثریت یعنی عوام الناس کے لیے باضابطہ تعلیم کی سہولتیں فراہم
کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ انجام کار یہ لوگ خود رو پودوں
کی طرح زندگی گزارتے رہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی مادی اور تہذیبی
دونوں حیثیتوں سے مفلس اور پس ماندہ رہ جاتے ہیں مگر یہ صورت
حال نہ صرف اس نچلے طبقے کے لیے تکلیف دہ ہے بلکہ اس سے
پورے سماج کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے گھسٹتا
رہتا ہے۔ اس کے برعکس اب ایک ایسے سماج کو لیجیے جس نے
قومی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ یہ سماج صرف چھوٹے
سے طبقے کے عروج پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے نزدیک یہ امر
ناگزیر ہے کہ سب کے لیے برابر کے تعلیمی مواقع فراہم کیے جائیں

کہ صرف اسی صورت میں ہر فرد اپنی فطری صلاحیتوں کو امکانی حد تک ترقی دے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ معاشرے کی تعمیر میں حصہ لے سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی کو بھی مادی اور تہذیبی دونوں لحاظ سے مالا مال کر سکتا ہے۔

کسی ملک کے تمام شہریوں کو تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک بھی اس مسئلے سے دوچار ہیں۔ ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنا اشد ضروری ہے۔ حکومت ہند نے ۱۹۶۴ء میں جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا اس نے مسئلے کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کی نوعیت اور وسعت کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ کمیشن نے خاص طور پر توجہ دلائی کہ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی میں عدم مساوات کئی طرح پیدا ہوتی ہے۔ کمیشن کی رائے میں دیہات اور شہر میں اس معاملے میں بین فرق ہے۔ شہر کے باشندوں کو گاؤں والوں کے مقابلے میں بہتر تعلیمی مواقع حاصل ہیں۔ ہمارے ملک میں لوگوں کے اقتصادی اور سماجی مدارج میں ایک بڑی خلیج حائل ہے۔ اس وجہ سے بھی سب کے لیے تعلیمی مواقع برابر نہیں ہیں۔ پھر آبادی کے بعض حصے تاریخی وجوہ کی بنا پر تعلیم کے میدان میں پچھڑے ہوئے ہیں مثلاً اچھوت اور نیچی ذاتیں، قبائلی لوگ اور عورتیں۔ کمیشن نے عدم مساوات کی مندرجہ بالا تمام صورتوں کی طرف بجا طور پر توجہ دلائی ہے۔ مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ اس مسئلے کا ایک اہم پہلو کمیشن کی نظر سے اوجھل رہا۔ وہ ہے لسانی اقلیتوں کا معاملہ کہ جنھیں

تعلیم کی وہی سہولتیں میسر نہیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہیں۔
جمہوریۂ ہند کے دستور اساسی کی رو سے ہر ریاست اپنی حدود کے اندر تعلیم فراہم کرنے کی ذمے دار ہے۔ اس سلسلے میں قانون بنانے اور نافذ کرنے کا اختیارِ کلی ہر ایک ریاست کو حاصل ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومتیں تعلیم سے متعلق اپنی اپنی پالیسی مرتب کرتی ہیں۔ تقریباً تمام ریاستوں نے ثانوی منزل تک اپنی علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے کے لیے چند ضروری اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔ مثلاً طلبہ کے لیے علاقائی زبانوں میں درسی کتابوں اور دیگر تعلیمی ادب کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ نیز اساتذہ کی ٹریننگ پر بھی کچھ توجہ دی گئی ہے کہ وہ علاقائی زبان میں تعلیم دینے کے قابل ہوسکیں۔ چنانچہ ابتدائی مدرسوں کے لیے اساتذہ کی تیاری کا کام اب ہر ریاست میں علاقائی زبان کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ لیکن ثانوی مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ پر یہ بات پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ بعض ریاستوں میں البتہ ثانوی منزل پر بھی اساتذہ کی تعلیم علاقائی زبان میں ہونے لگی ہے۔ خاص طور پر یہ ریاستیں وہ ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم کی منزل تک علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اصولاً یہ اقدام صحیح ہے، اس لیے کہ ہندستان میں ریاستوں کی تنظیم نو کم و بیش لسانی بنیاد پر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقائی زبان ہر ریاست میں رہنے والے لوگوں میں سے اکثریت کی مادری زبان ہے۔ تاہم ہوسکتا ہے کہ ایک ریاست میں کوئی ایسی قابلِ لحاظ اقلیت بھی موجود ہو جس کی

مادری زبان، اس ریاست کی اکثریت کی زبان سے مختلف ہے
جہاں تک عوام کی اکثریت کی تعلیم کا تعلق ہے، علاقائی زبان کو
ذریعہ تعلیم بنانا بہت مناسب ہے۔ مگر اس پالیسی کے تحت لسانی
اقلیتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سب کے لیے مساوی
تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

لسانی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا مسئلہ
ابھی تک ہمارے ملک میں محتاج توجہ ہے۔ یہ بے توجہی نہ صرف
اقلیتوں کے حق میں مضر ہے بلکہ ملک کو بھی اس کی بھاری قیمت
ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ اقلیتی
طبقے کے بہت سے لوگ تعلیم سے محروم رہ گئے ہیں بلکہ ریاستی پالیسی
کے خلاف ان کے اندر ذہنی اور جذباتی فصیل قائم ہو گئی ہے۔ اس
طرح اکثریتی فرقے اور ریاست کے خلاف اقلیتوں میں شکوک و
شبہات پیدا ہونے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقلیتی فرقے کے
لوگ قومی دھارے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ قومی ترقی کی راہ
میں یہ ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ علاوہ بریں اس کی وجہ سے
اقلیتیں ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا ہیں اور اس کے اثرات
بہت مضر ثابت ہو رہے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ زندگی ان کے لیے
اور بھی سوہان روح ہوتی جا رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاستیں اس مسئلے کو حل
کرنے میں کیوں ناکام رہی ہیں۔ ہمارے ملک کے دستور اساسی
میں یہ چیز واضح کر دی گئی ہے کہ کم از کم ابتدائی تعلیم ......

لازمی طور پر مادری زبان کے ذریعے دینی چاہیے اور اس کا اطلاق اقلیتوں پر بھی ہونا چاہیے۔ ریاستیں عموماً اقلیتوں کو یہ بنیادی حق دینے سے گریز کرتی ہیں۔ اور اس کے لیے ریاستوں کی جانب سے اکثر یہ تاویل پیش کی جاتی ہے کہ اس صورت حال کی اصل وجہ مالی اور انتظامی دشواریاں ہیں اور یہ کہ فی الوقت ان دشواریوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

آیئے، اب ایک ٹھوس مثال لے کر دیکھیں کہ ان دشواریوں سے کیا مراد ہے۔ اتر پردیش اور بہار میں بالخصوص اور شمالی ہند میں بالعموم ایک بڑی اقلیت کا دعویٰ ہے کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ آزادی سے پہلے پورے ملک کی تعلیم، تجارت اور نظم و نسق میں اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم اردو کو وہی درجہ حاصل تھا جو دوسری ملکی زبانوں کو نصیب تھا لیکن آزادی کے بعد اردو کی حیثیت روز بروز کم ہوتی گئی، اردو داں طبقے کے مستقل مطالبے کے باوجود صرف چند مدرسے ایسے ہیں جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ جب کہ حکومت کی دستور ہند کے مطابق یہ علانیہ پالیسی ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں اردو کے ذریعے ابتدائی تعلیم دی جانی چاہیے۔ لیکن عملی طور پر یہ اصول شاذ و نادر ہی برتا جاتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں مختلف قسم کی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ مالی اعتبار سے ان کے لیے علاحدہ مدرسے

کھولنے کا کوئی جواز نہیں۔ اردو مدارس کھولنے کا ذکر ہی کیا بعض صورتوں میں تو کسی مدرسے میں اردو کی ایک جماعت یا ایک سیکشن کھولنے تک سے اسی بنا پر گریز کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اساتذہ کی کمی ہے اور اردو میں لکھی ہوئی درسی کتابیں بھی موجود نہیں۔ دراصل یہ تمام حیلے ہیں۔ جب ملک میں اردو کے ذریعے استادوں کی تربیت کا کوئی انتظام ہی نہیں تو اس بات کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ اردو مدارس کے لیے باصلاحیت استاد دستیاب ہوسکیں اور اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے لیے درسی کتابیں تیار کی جاسکیں۔

قومی یک جہتی اور قومی ترقی کے پیش نظر لسانی، تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ سنجیدہ غور و فکر کا مستحق ہے۔ قومی اقلیتوں کی تعلیم کے مسئلے کو اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندستان کے تمام باشندوں کے تہذیبی ورثے کو فروغ دینا ہے۔ یہ مسئلہ یقیناً پیچیدہ ہے لیکن اگر نیک نیتی اور پختہ ارادہ ہو تو کوئی بھی مسئلہ ناقابل حل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتوں کی تعلیم کے مسئلے کو ہر جانب سے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اردو داں اقلیت کی تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں چند تجاویز حسب ذیل ہیں:

جہاں کہیں بھی ایسے بچے مناسب تعداد میں موجود ہوں جن کی مادری زبان اردو ہے، وہاں اردو کے مدرسے، جماعتیں یا سیکشن

کھولے جائیں۔ اردو زبان میں طلبہ کے لیے تمام مضامین کی درسی کتابیں تیار کرائی جائیں اور استادوں کی رہنمائی کے لیے بھی اردو میں کتابیں لکھوائی جائیں۔ جس علاقے میں اردو مدارس کافی تعداد میں پہلے سے موجود ہوں، وہاں ایسے ٹریننگ اسکول یا کالج قائم کرنے چاہییں جن میں اردو کے ذریعے تعلیم دی جائے، اور ان مدرسوں کو استادوں کی ٹریننگ کے لیے بطور مشقی مدارس استعمال کیا جائے۔ اساتذہ کی تیاری کے پروگرام کو موثر طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ زیر تربیت اساتذہ اور ان کے معلمین کے لیے اردو میں موزوں کتابیں تیار کرائی جائیں۔ یہ ایک اچھا شگون ہے کہ حکومت ہند نے ملک کی تمام زبانوں میں کتابیں تیار کرنے کی ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے کتابیں تیار کرائی جا رہی ہیں۔ ایسی کتابیں بھی اس اسکیم میں شامل ہیں جو ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں میں ان اساتذہ کی تیاری میں استعمال کی جاسکیں گی جنھیں اردو زبان کے ذریعے مدارس میں تعلیم دینی ہوگی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاستی حکومتیں بھی اسی طرح اپنی علاقائی زبانوں اور اقلیتی زبانوں میں درسی کتابیں اور تعلیمی ادب کی تیاری کا کام سنجیدگی سے انجام دیں۔ ریاستوں کو چاہیے کہ خاص طور سے ایسی کتابوں کی تیاری پر توجہ مرکوز کریں جو ابتدائی مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ میں مفید ثابت ہو سکیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو اردو کے ابتدائی مدارس کے اساتذہ کیلیے کتابوں کی تیاری اور اشاعت کی ذمے داری بڑی حد تک شمالی ہندوستان کی ریاستوں پر عائد ہوتی ہے۔ خاص طور سے اتر پردیش اور بہار کی ریاستوں پر۔

۲۱۔ مُسلمانوں کی ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم کے مرحلے پر نوجوان اپنی زندگی کے حساس ترین دور سے گزرتا ہے اور اس کے مستقل طرزِ عمل کے سانچے بنتے ہیں۔ اسی مرحلے پر وہ کاروبارِ حیات کے لیے اپنے آپ کو تیار بھی کرتا ہے۔ ثانوی منزل پر مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ نازک ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے بہت سے ذہنوں میں جو تصویر بنتی ہے اس میں فرقہ پرستی کا رنگ خاصا نمایاں ہوتا ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں میں آج بھی ایک ایسا بااثر طبقہ موجود ہے جو مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ تعلیمی نظام کا حامل ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ اسلام مذہب کی حیثیت سے ایک ہمہ گیر اور جامع طرزِ زندگی کا حامل ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ایک ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا جائے جو اس نظامِ زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ اس خیال کے حامیوں کی رائے میں تعلیم کو مذہب سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اُن کی نظر میں تعلیم صرف دینی تعلیم ہے اور بس۔ یہ لوگ اس نظامِ تعلیم کی تجدید کے خواہاں ہیں جو ہندستان

میں پٹھانوں اور مغلوں کے دورِ حکومت میں کوئی ایک ہزار سال تک رائج رہا۔ اس دور میں مسلمانوں کے جداگانہ تعلیمی اداروں کی تقریباً ایک مستقل روایت قائم رہی۔ مکتب اور مدرسے یہ کام انجام دیتے تھے اور انھیں حکمرانوں اور دوسرے علم دوست مربیوں سے گرانقدر عطیے ملتے تھے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک سماج کی ساخت میں جو ہمہ گیر اور بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں، انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جاگیردارانہ سماج میں تو غالباً تعلیمی مواقع کو چند لوگوں تک، عام سماج کو نقصان پہنچائے بغیر، مخصوص اور محدود کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت جیسا کچھ سیاسی نظام تھا اور اس نے جو بھی پیداواری طریقے وضع کیے تھے، اُن کے لحاظ سے یہ چنداں ضروری نہ تھا کہ عوام الناس کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ صرف چند با رسوخ افراد تعلیم سے فیض یاب ہو کر اپنی سماجی، اقتصادی اور سیاسی حیثیت کو یا تو باقی رکھتے تھے یا بہتر بناتے تھے۔ اس کے برخلاف لوگوں کی بھاری اکثریت ابتدائی تعلیم سے بھی ناآشنا رہتی اور نتیجے کے طور پر اپنے آپ کو انتہائی اسفل سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور پاتی۔ یہ طریقہ مروجہ سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا عظیم سماجی تبدیلیوں اور جمہوری سماج کے قیام کے باوجود ایسی صورتِ حال برقرار رہ سکتی ہے؟ ایسے سماج میں ہر فرد اہم ہے۔ اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے۔ اس کے علاوہ سائنس اور ٹیکنولوجی نے ہر شخص کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی

کو مادی اور تہذیبی لحاظ سے مالا مال بنا سکے۔ نتیجے کے طور پر آج منظم ہمہ گیر تعلیم ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان نے ایک جمہوریہ کی شکل اختیار کی ہے۔ اس لحاظ سے ہندستانی ریاست کا فرض ہے کہ وہ ذات، رنگ اور عقیدے کی تفریق کیے بغیر اپنے سارے شہریوں کو مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرے۔ اس لیے کہ اس صورت میں ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے کر قومی فلاح کے کام میں مؤثر ترین کردار انجام دے سکتا ہے۔ اس طرح وہ اخلاقی طور پر اجتماعی مسائل کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کا حق حاصل کر لیتا ہے۔

جن بدلے ہوئے حالات کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، اُن کی روشنی میں یہ کہنا کہ مسلمانوں یا کسی اور فرقے کی تعلیم جداگانہ انداز سے ہو، انتہائی غیر حقیقت پسندانہ بات ہے۔ یہ تجویز نہ صرف قومی سالمیت کے لیے انتہائی خطرناک ہے بلکہ مسلم فرقے کے مفادات کو بھی یقیناً نقصان پہنچا سکتی ہے۔ تہذیبی معاملات میں اور بالخصوص تعلیمی میدان میں، جہاں بھی علاحدگی پسندی کا چلن ہے، خطرناک انسانی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ جو لوگ تعلیمی معاملات میں علاحدگی پسندی کا پرچار کرتے ہیں انھیں امریکہ کے سیاہ فام باشندوں سے سبق لینا چاہیے کہ وہ اس وجہ سے تعلیمی اور تہذیبی میدان میں دوسروں کے مقابلے میں کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔

واقعی جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کی تعلیم کے جداگانہ نظام کا مطالبہ کریں بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم

حکومت پر زور دیں کہ وہ تمام لوگوں کے لیے، جس میں مسلم فرقہ بھی شامل ہے، مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرے۔ ہمیں سب سے زیادہ جس بات پر اصرار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تعلیمی مواقع کی مساوات نہ صرف اصولاً تسلیم کر لی جائے بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے بہت سے اقدامات کیے جانے چاہییں۔

ثانوی تعلیم کے مرحلے پر ضروری ہے کہ ہم تعلیمی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لیے خصوصی کوشش کریں اس لیے کہ ہمارے ملک میں ثانوی تعلیم ابھی تک نہ تو مفت ہی ہے اور نہ ہی لازمی تعلیم کے اس مخصوص شعبے میں مسلمانوں کو جن حالات کا سابقہ ہے، وہ ہماری تاریخ کی پیداوار ہیں۔ ثانوی تعلیم کی منزل پر مسلمانوں کے تناسب کو ظاہر کرنے کے لیے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں پھر بھی یہ بات قرین قیاس ہے کہ قومی اوسط سے اُن کی شرح تعلیم کم ہے۔ یہ صورت حال انتہائی المناک ہے، کیوں کہ ثانوی تعلیم ہر ایک پیشہ ورانہ تربیت کے لیے اولین شرط ہے۔ آزادی کے بعد سے تعلیمی مواقع میں جو توسیع ہوئی ہے اُس سے مسلمان یقیناً فائدہ نہیں اُٹھا رہے ہیں۔ مختلف وجوہ سے تعلیم کی دوڑ میں وہ دوسرے فرقوں سے پچھڑ گئے ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کی پس ماندگی کی سب سے اہم وجہ ان کی اقتصادی کمزوری ہے وہیں دوسری طرف کچھ اور سماجی اور نفسیاتی رکاوٹیں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اسکولوں میں اکثر ایسے طریقے رایج ہو گئے ہیں جن سے مسلمانوں کو تنفر محسوس ہوتا ہے۔ اور جو ان کے عقائد کے منافی ہیں۔ ان،

سرگرمیوں سے ان کے جذبات بھی مجروح ہوتے ہیں۔ کبھی نصاب اور نصابی کتابوں میں ایسا مواد شامل کر لیا جاتا ہے جو مسلمانوں کو سرکاری تعلیم کے اداروں سے الگ رکھتا ہے۔ پھر ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ خاصا نازک اور پریشان کن مسئلہ ہے، بالخصوص ان علاقوں میں جنھیں ہندی بولنے والوں کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ ایسے علاقوں میں مسلمان برہم ہوتے ہیں کہ وہاں انھیں ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں اردو کو بے سروسامان کر کے تعلیمی اداروں سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ پر ہندی کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ان پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے مسلمان حکومت کی طرف سے فراہم کی ہوئی تعلیمی سہولتوں سے استفادہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس طرح مسلمان تعلیمی لحاظ سے پچھڑ گئے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ انتہائی تیزی سے کچھ تدارکی اور اصلاحی اقدام کیے جائیں۔ اسکولوں میں رائج سرگرمیوں، اہم نصابی مشغلوں، نصابوں اور نصابی کتابوں کو ایسے عناصر سے پاک کرنے کی ضرورت ہے جو ہندستانی عوام کے کسی بھی فرقے میں علاحدگی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو چیز اور بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسکول کے مجموعی پروگرام میں قومی یک جہتی کی روح کارفرما ہو اور اسے اس طور پر مرتب کیا جائے جس سے تمام لوگوں کے اندر وطن سے وابستگی کا جذبہ پیدا ہو، خواہ وہ کسی ذات کے ہوں، کوئی مذہب مانتے ہوں، کوئی

زبان بولتے ہوں یا کسی علاقے کے ہوں۔

تعلیم کے میدان میں جو صورتِ حال ہے اس سے صرف مسلمانوں کے مفادات کو ہی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ پوری قوم کی رفتارِ ترقی بھی متاثر ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک قومی خسارہ ہے اس لیے کہ مسلمان ملک کی ایک معتد بہ اقلیت ہیں۔ وہ کل آبادی کا تقریباً دسواں حصّہ ہیں۔ اگر مسلمانوں کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جاتے ہیں، تو اس سے قومی ترقی کا کام آگے بڑھے گا۔ اس طرح کے منصوبے میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس سے سیکولرازم اور قومی یک جہتی کی اقدار مجروح یا متاثر ہوتی ہیں۔ خود ہمارے ملک کے آئین میں کہا گیا ہے کہ یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ "کمزور طبقوں" مثلاً پچھڑی ہوئی ذاتوں، قبیلوں، عورتوں اور پس ماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی اقدام کرے۔ لہٰذا یہ بات مساوی مواقع کی فراہمی کے اصول کے منافی ہوگی اگر ہم اُن لوگوں کو خاص سہولتیں بہم نہ پہنچائیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔" یہ بات ویسی ہی نامناسب ہے جیسے ہم نا برابر لوگوں کے ساتھ برابری اور برابر والوں کے ساتھ نابرابری کا سلوک کریں۔" کمزور طبقوں کے ساتھ بہتر اور سازگار سلوک کے ذریعے ہی پوری قوم کی ترقی کی ضمانت کی جا سکتی ہے۔ کون ہے جو اس بات سے انکار کر سکے گا کہ زنجیر کی مضبوطی کا تعین اس کا کمزور ترین حلقہ ہی کرتا ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں خصوصی مراعات کے مسئلے کی

وضاحت کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ اس ضمن میں کس طرح کی سہولتیں درکار ہیں اور ان کی تکمیل کیسے ہو سکتی ہے۔

ابتدائی تعلیم کے مرحلے پر کچھ ایسے طلبہ ضرور ملتے ہیں جن میں آئندہ اچھے طالب علم بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اُن سے توقع کی جاتی ہے کہ آگے چل کر بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دے سکیں گے۔ ان طالب علموں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو مالی پریشانیوں کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے۔ ایسے ہی بہت سے طالب علم ثانوی اسکول یا کالج کے مرحلے پر مل سکتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کو تعلیم جاری رکھ سکنے کا موقع نہ دینا ان کی صلاحیتوں کا خون کرنا ہے اور اس طرح بالآخر پوری قوم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ایسے طالب علموں کو مناسب وظائف دیے جائیں۔ تاکہ اُن کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوں اور وہ قوم کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

ہندستان میں اس وقت جو صورتِ حال ہے اس کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ نوجوانوں کو ثانوی تعلیم کے مرحلے پر مختلف پیداآور کاموں کی تربیت دی جائے۔ متوسط طبقے کا مسلمان نوجوان ایک طرح کی 'محفوظ ملازمت' کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ ایسے پیداآوری کاموں کو پسند نہیں کرتا جن میں جسمانی محنت درکار ہوتی ہے اور ہاتھ میلے ہوتے ہیں۔ لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ مختلف پیشہ ورانہ کاموں کی تربیت حاصل کرے۔ اس کے لیے جہاں ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے تربیتی

مراکز کی سہولتیں مہیا کی جائیں جن سے مسلمان نوجوان فائدہ اٹھا سکیں، وہاں دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ حاجت مند نوجوانوں کو مالی امداد دی جائے تاکہ وہ ان مواقع سے مستفید ہو سکیں۔ ایسا ہی طریقۂ کار ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے میدان میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ وہ شعبے ایسے ہیں جن میں مسلمان اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں، کسی نہ کسی سبب سے، بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جس منصوبے کی ابھی نشان دہی کی گئی ہے، اس کی تکمیل کیسے کی جائے۔ بدقسمتی سے اس میدان میں اب تک جو کام ہوا ہے وہ انتہائی مختصر اور ناکافی ہے۔ وہ ادارے جن کا تعلق مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے ہے، اپنے تمام تر وسائل اور ساری توجہ یا تو دینی تعلیم پر مرکوز کیے ہوئے ہیں یا یتیم خانے چلاتے ہیں۔ یہ بات واقعتاً بڑی افسوسناک ہے اور مسلمانوں کے سماجی شعور پر عام طور پر، اور خاص طور پر اوقاف کے اداروں پر بہت ہی کربناک تبصرہ ہے۔ ہندوستان میں مسلم اوقاف کے پاس جو جائدادیں اور اثاثے ہیں، ان کی مالیت تقریباً پانچ سو کروڑ روپے ہے۔ ان اثاثوں سے جو مجموعی آمدنی ہوتی ہے اسے مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کیا جا سکتا ہے ایسی تعلیم پر جو انھیں سماج کا مفید اور کارگر رکن بنا سکتی ہے۔ مقامی وسائل کو بھی یکجا کر کے ایک ایسا فنڈ قائم کیا جا سکتا ہے، جس کی مدد سے ایسے ضرورت مند اور باصلاحیت

نوجوانوں کی ضروریات تعلیم پوری کی جاسکتی ہیں جو اپنی تعلیم کے ثانوی مرحلے پر ہیں۔ دراصل، اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح ایسی مؤثر اور مناسب تنظیموں کو قائم کیا جائے جو مسلمانوں میں تعلیم کے کام کو آگے بڑھا سکیں۔ اس کام میں مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جیسی تنظیموں کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ کام پورے خلوص سے کرنے کا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے فرقہ وارانہ قرار دیا جاسکے۔ یہ کام ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو از خود اس کی رفتار بھی بڑھ جائے گی۔

اس مضمون کے اختتامیے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان الفاظ سے زیادہ موزوں الفاظ نہیں ہو سکتے جو انھوں نے ایک خاص موقع پر کہے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پچپنویں اجلاس میں جو علی گڑھ میں مارچ ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوا تھا، انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ خیال پیش کیا تھا:

> "بدلے ہوئے حالات میں بھی اس ملک کے مسلمانوں کے، جیسے کہ ہر ہندستانی گروہ کے، مخصوص مسائل رہیں گے اور اُن پر غور و بحث ہمارا فرض ہوگا۔ لیکن ان مسائل کا اور ان پر غور و فکر کا پس منظر دوسرا ہوگا۔ اب ہمیں ان پر غور کرنا ہوگا اس نقطۂ نظر سے کہ کل کی بہبود کے لیے جزو کی فلاح بھی لازم ہے ۔۔۔۔ ہم مسلمان شہریوں کی ترقی کے مسائل پر سوچیں گے تو اس لیے کہ ان کا صحیح حل نہ ہونے سے مسلمانوں

ہی کو نہیں ساری قومی زندگی کو نقصان پہنچے گا اور
ان کے صحیح حل سے ساری قومی زندگی فروغ پائے
گی.... ایک دوسرا تقاضا اس سے بھی زیادہ اہم
یہ ہے کہ ہم پر اب ذمے داری آئے گی کُل قوم کے
مسائل تعلیم و تربیت پر غور و فکر کی بھی......
مسلمان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ایک
خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کے
دنیوی اور سیاسی مفاد کی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا
ہے. مسلمان پر ساری دنیا کی ذمے داریاں بھی
ہیں، مسلمان ہونے کے معنی ہیں زندگی کا ایک مطمح
نظر رکھنا. اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے
کچھ معیار تسلیم کرنا.... قوم کا سارا تعلیمی کام
اب ہمارا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی اور کا.
ہم پر بھی اس کی راہیں روشن کرنے کا فرض ایسا
ہی عائد ہوتا ہے جیسا کسی اور پر۔"

حصہ ششم

چند معلّمین

۲۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین — افکار و نظریات

ہندستان میں اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سبھی اہم پہلوؤں کا ذاکر صاحب نے بغور مشاہدہ کیا اور اپنے علم اور مطالعے کی روشنی میں ان سے متعلق نظریات قائم کیے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں، ان نظریات کی آئینہ دار ہیں۔ یہاں ہم صرف دو چیزوں سے بحث کریں گے، ایک تو یہ کہ ذاکر صاحب کے نزدیک قومیت اور قومی تعلیم کا تصور کیا تھا اور دوسرے یہ کہ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور وہ کس قسم کا سماج قائم کرنا چاہتے تھے، در اصل یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

موضوع کی حد بندی کرنے کے بعد بھی یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ مضمون کو کیسے شروع کیا جائے۔ غالباً اس معاملے میں اس سے مدد ملے گی کہ اگر ذاکر صاحب آج زندہ ہوتے تو ملک کے موجودہ حالات سے ان کے دل و دماغ پر کیا کیفیت طاری ہوتی۔ ان کے انتقال کے بعد ملک کو نہایت شرمناک فرقہ وارانہ

حادثات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ درندگی اور بہیمیت کے اعتبار سے یہ بھی کم و بیش اسی درجے کے ہیں جو ملک کے بٹوارے کے وقت رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات سے ایک بار پھر ہمارے کانوں میں ذاکر صاحب کے وہ الفاظ گونجنے لگے ہیں جو انھوں نے جامعہ کی سلور جبلی کے موقعے پر ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے،

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے، حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنبھال سکیں گے؟..... ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم یہ سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں.... خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔

یہ مسئلہ اس قوم اور اس کے زندہ رہنے کا نہیں
ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی
میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں
مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھدنے نہ دیجیے۔"

کتنا گہرا درد اور شدید کرب ہے ان الفاظ میں! آج کا ہندوستان ۱۹۴۷ء کے ہندوستان سے مختلف ہے، ملک کے دو حصے ہو چکے ہیں اور دونوں حصے اپنی اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ لیکن قوم کے لیڈروں سے ان الفاظ میں جو اپیل کی گئی ہے اس کی معنویت کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ اور آج روئے سخن چند چوٹی کے نیتاؤں کی طرف نہیں بلکہ دیس میں بسنے والے سب کے سب مخاطب ہیں۔ اس آواز میں ایک پیغام عمل پوشیدہ ہے جو ہم سب کو جدو جہد کی دعوت دیتا ہے۔

ہندوستان کی متحدہ قومیت کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ مذہب، ذات پات، تہذیب، زبان اور علاقے کی بنا پر شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ قومی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم کرنے کی کوششوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۹۳۵ء میں فرمایا تھا:

"مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی
قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں
جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے

مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے،
وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ
قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی
کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں
یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت
مسلمان ہی نہیں، بحیثیت ہندستانی کی حیثیت سے
بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت
کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے
مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان
کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

اسی خطبے میں ذاکر صاحب نے قومی تعلیم کے مسئلے کا بھی ذکر کیا ہے اور تعلیم کے سماجی اور تہذیبی تصور کی روشنی میں اس گتھی کے حل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے،
مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے
ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے
کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا
ہیں، مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں، قومی تعلیم کا نظام
بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت
کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں
ان تفریقوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا

ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپکے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانش مندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائے گا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لیے لازمی مانا جائے گا"

دراصل قومی یک جہتی اور قومی تعلیم کا یہ تصور اُس تصور سے بالکل مختلف ہے جو بعض قومی یک جہتی کے نام لیوا "بھارتی کرن" کے نعرے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اکثریت کی تہذیب ہی فقط ہندستانی تہذیب کہلانے کی مستحق ہے۔ اس لیے اسی کو تمام لوگوں پر مسلط کر کے قومی یک جہتی کی ضمانت کی جا سکتی ہے۔ یہ گروہ کثرت میں وحدت تلاش کرنے کا قائل نہیں اور اسی وجہ سے اُسے وحدت میں کثرت گوارا نہیں

ذاکر صاحب کا قومی تعلیم سے متعلق یہ خیال تعلیم کے اُس تصور سے ہم آہنگ ہے جو انھوں نے متعدد بار مختلف موقعوں پر واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں؛

"سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب

ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں سے ظاہر کرتا ہے، یا یوں کہیے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ چیزیں بنائی تھیں۔ ان سب کا اثر یوں کہیے کہ ان چیزوں میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے، کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں اُبھرتی ہیں، سوئی ہوئی طاقتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے، اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک ہونی چاہیے جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے ذہن میں جاگی ہیں — مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹے جائے، ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی، اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لاکر چھپایا تھا، سُلایا تھا۔"

ہر تعلیم کا یہ تصور اصل میں تمدنی یا تہذیبی اشیا کے لین دین کا معاملہ ہے۔ یہ لین دین صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ لینے اور دینے والے دونوں کی طبیعت میں کسی حد تک یکسانی ہو۔ اسی بات کو ذاکر صاحب نے کسی اور جگہ مختصر الفاظ میں اور جامع طور پر یوں کہا ہے: "ذہن معروض اور ذہن موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گر ہے۔" یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب سب کے لیے ایک قسم کی تعلیم اور وہ بھی فقط کتابی تعلیم کے مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک طلبہ کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو صرف ان اشیائے تمدنی سے اپنی ذہنی تربیت کا انتظام کر سکتی ہے، جن کا تعلق ہاتھ کے کام سے ہے، کچھ بنانے بگاڑنے سے ہے، توڑنے جوڑنے سے، غرض کچھ کرنے سے ہے۔

ذاکر صاحب تعلیم میں نری انفرادیت کے قائل نہ تھے، وہ فرد اور سماج کے باہمی رشتے کو ذہنی زندگی کی اصل سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے،

> "ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں .... ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے، یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ سے ہی جلایا جا سکتا ہے..... اسی لیے ذہنی زندگی کے لیے، جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے، بدن میں ہر حصے کی کچھ الگ حیثیت

بھی ضرور ہوتی ہے، مگر اسی حد تک کہ وہ کل
جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت
انجام دے رہا ہے، ایک حصے کے کٹ جانے سے
جسم میں کمی آجاتی ہے۔ مگر وہ باقی رہ سکتا ہے،
مگر حصہ جسم سے الگ ہوکر باقی بھی نہیں
رہ سکتا۔"

اسی لیے ذاکر صاحب کے نزدیک تعلیم محض ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا نام نہیں، اپنی جنت پختہ کرنا، نام و نمود یا آسایش حاصل کرلینا بھی تعلیم کا مقصد نہیں۔ اور نہ ہی کسی فن میں کمال حاصل کرلینا، یا کوئی خاص مہارت پیدا کرلینا، تعلیم کا منصب ہے۔ تعلیم صرف اسی وقت تعلیم کہلانے کی مستحق ہے جب کہ وہ کسی جماعتی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ فرماتے ہیں:

"تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں
کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے...
جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت
کے لیے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس
کی ہنرمندی جماعت کے انتشار کا باعث بن
سکتی ہے۔"

ذاکر صاحب کے افکار پر فلاطون اور جرمنی کے بعض مفکرین کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب نے فلاطون کی شہرۂ آفاق تصنیف "ریاست" یا "تحقیق عدل" کا ترجمہ انگریزی سے اردو

میں کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا اس میں وہ فلاطوں کے بعض بنیادی خیالات سے متفق نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں،

"حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نموبخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے، امن و آرام یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا ہے اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کرتا ہے جو عورت میں محض بحیثیت جنس نہیں ہوتیں۔ اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاع گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی ․․․․ فلاطوں کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت، کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔"

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار میں فلاطوں کے اس اصول کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے جسے اس نے "تخصیص کار" کے اصول کا نام دیا ہے۔ مقدمے میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے،

"فلاطوں فرد کو جسم اجتماعی کا ایک عضو مانتا تھا۔ اس لیے اس نے اس اخلاقی صفت

پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی بجائے نفس کا
بندہ بن جانے کے بجائے ضبطِ نفس سے کام لیتا
ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام
اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفۂ اصلی کو پورا کرتا
ہے۔ اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے
پردے میں چھپی ہوئی تھی، فلاطوں اجتماعی
تعاون کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے
تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے تاکہ ہر فرد
اور ہر طبقہ اپنے فرض مفوضہ کو قناعت اور خوش دلی
سے انجام دیتا رہے۔ اپنا "دھرم" پورا کرتا
رہے کہ فلاطوں کی نظر میں یہی اجتماعی زندگی
کا سچا اصول یعنی عدل ہے..... اس تخصیصِ کار
کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد
اور ہر طبقے کو اس کے وظایف مخصوص کے لیے
تیار کرنے کا انتظام کیا جائے، یہ تعلیم کا
کام ہے۔"

ذاکر صاحب فلاطوں کے اس نظریے کے حامی تو نہیں، جس کے مطابق وہ سماج کو تین طبقوں میں مستقل طور پر تقسیم کرتا ہے، یعنی حکمراں فلسفیوں کا طبقہ، ریاست کے محافظوں، جنگ آزماؤں کا طبقہ اور دولت پیدا کرنے والوں یا محنت کشوں کا طبقہ، مگر ذاکر صاحب فلاطوں کے اس معاملے میں ہم نوا معلوم ہوتے ہیں کہ سماج میں

تقسیمِ کار کا اصول کار فرما ہونا چاہیے کہ یہی وہ کام ہے جس کے ذریعے فرد نہ صرف سماج کی خدمت کرکے اسے مستحکم اور پائیدار بنا سکتا ہے بلکہ خود اپنی نشو و نما کا اہتمام کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب افلاطون کے اس خیال کی بھی تائید کرتے ہیں کہ تعلیم درحقیقت ریاست کا کام ہے۔ انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی دوسری سالانہ کانفرنس، ۱۹۴۱ء میں اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

"میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے، یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا گروہ کی حکومت کا نام ہے، تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم بھی زیادہ دیر تک سیدھے راستے پر نہیں چل سکے گی۔ ہاں ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنا عدل پر ہو، جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کرکے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہو اور دن پر دن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقہ کیا ہر آدمی کی اخلاقی شخصیت کی پوری ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہوتا جاتا ہو، تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس

لیے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اسس کام سے ہوتی ہے۔"

تعلیم میں اور خاص طور پر ابتدائی تعلیم میں جسے بنیادی تعلیم بھی کہتے ہیں، ذاکر صاحب نے ہاتھ کے کام پر بہت زور دیا ہے کہ یہی ان کے نزدیک اسس عمر کے بچوں کی تعلیم کا موزوں اور موثر ذریعہ ہے مگر وہ تعلیمی کام کو میکانکی عمل بنانے کے خلاف ہیں کیوں کہ بلا سوچے سمجھے کسی عمل کو بار بار دہرانا تعلیمی کام نہیں ہے۔ تعلیمی کام صرف وہی ہے جس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو۔ وہ کہتے ہیں:

> "سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے، پھر اسس میں پورا اترتا ہے تو

وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں۔ کام ریاضت ہے کام عبادت ہے۔"

ذاکر صاحب تعلیم کے علاوہ معاشیات کے بھی طالب علم تھے۔ ۷۵-۱۹۲۲ء میں "سرمایہ داری" کے موضوع پر انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں جو لکچر دیے تھے، وہ ان کے اقتصادیات سے متعلق نقطۂ نظر کی تشریح کرتے ہیں۔ وہ "سرمایہ داری" کو ایک تہذیبی اور تمدنی مظہر کی حیثیت سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں سائنسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ وہ ان سماجی محرکات کی کھوج کرنا چاہتے ہیں جن سے "سرمایہ داری" عالم وجود میں آئی اور پروان چڑھی۔ وہ اس کی اچھائی یا برائی پر حکم لگانا نہیں چاہتے۔ مگر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو اخلاقی اقدار کا پیرو ہو اور جس نے اپنی حیات عزیز کا بیشتر حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا ہو "سرمایہ داری" جیسے ایک سماجی مظہر کو خالص معروضی نقطۂ نظر سے سمجھے اور سمجھائے۔ اس نقطۂ نظر کو اپنانے میں غالباً انھیں اپنے استاد زوم بارٹ کی پیروی مقصود ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنے پہلے لکچر میں خود واضح کیا ہے۔ مگر ذاکر صاحب کا آخری لکچر ان کی آرزوؤں کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں انھوں نے آئینۂ حال میں مستقبل کی جھلک دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں: "جب سماج کے قابو میں پوری معیشت آجائے گی اور جب وہ ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت ہو جائے گی صرف اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ضمیر اجتماعی کا حالاتِ محنت پر اختیار ہوگا۔" اُس وقت ذاکر صاحب

نے بشارت دی تھی کہ ہندستان میں سرمایہ داری اپنے مفاد کی خاطر ضروری تنظیم کرے گی اور جب وہ نامعقول پاگلوں کی سی حرکتیں کر چکے گی تو سماجی ضمیر بیدار ہوگا اور اپنا زور دکھائے گا اور اس معیشت کو جس کی بنیاد ذاتی فائدے پر ہے، ایسی سماجی معیشت میں تبدیل کر دے گا جو منصوبہ بندی کے ذریعے سب لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا اپنا مقصد سمجھے گی ـــــ اس وقت ذاکر صاحب نے کتنی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ نہ جانے وہ دن کب آئے گا اور قطرے پر گوہر ہونے تک کیا کچھ گزرے گی ــ مگر ہم جانتے ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں اس منزل کی طرف ملک نے قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا، گو کہ بہت جھجک اور سست رفتاری کے ساتھ۔ دیکھیے اُن کے خواب کی تعبیر کب ہوتی ہے!

۲۳- ٹیگور، بحیثیت معلّم

رابندر ناتھ ٹیگور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف 'گیتانجلی' نے انھیں دنیا کے چوٹی کے ادیبوں کی صف میں ایک ممتاز مقام بخشا۔ انھیں اپنے گیتوں کے اس مجموعے پر ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز ملا جو اس بات کا اعتراف تھا کہ عالمی ادب میں یہ ایک اعلیٰ پائے کا شاہکار ہے۔ اس کی بدولت نہ صرف ٹیگور کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، بلکہ اس سے دنیا میں ہندستان کا نام روشن ہوا۔

اگرچہ ٹیگور کی زندگی میں شعر و ادب کا پہلو سب سے نمایاں ہے، لیکن وہ دراصل ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان جیسی شخصیتیں شاذ ہی نمودار ہوتی ہیں وہ ایک زمانے کی بہترین روح کا آدرش پیش کرتی ہیں۔ ایسی ہی عہد آفریں شخصیتوں کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ٹیگور یقیناً اسی قسم کے ایک دیدہ ور تھے۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ کے ہر میدان میں نئی راہیں نکالیں۔ شاعری ہو یا موسیقی، مصوری ہو یا رقاصی، ڈراما نگاری ہو یا اداکاری۔ غرض، ہر فن میں ٹیگور نے اپنے ساحرانہ کمال سے نئے جادو جگائے۔ گویا انھوں نے جس چیز کو چھو لیا، اسے پارس بنا دیا۔ تاریخِ انسانی میں ہر ایک صنفِ فن میں الگ الگ ایک سے ایک بڑھ کر فن کار مل جائے گا۔ مگر ایسی ہستیاں بہت کم نظر آئیں گی، جن کی تمام فنون میں بیک وقت عظمت تسلیم کی گئی ہو۔ ٹیگور کے متعلق غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا عؔ

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ٹیگور گیت لکھتے تھے۔ اس کی دُھن، لے اور تال بھی مقرر کرتے تھے۔ خود گاتے بھی تھے اور دوسروں کو گانا سکھاتے بھی تھے۔ وہ ڈراما لکھتے تھے، خود ہی ہدایت کاری کرتے تھے اور اداکار کی حیثیت سے اس میں حصّہ بھی لیتے تھے۔ اور پھر یہی نہیں کہ ٹیگور نے اپنی ذات کو فقط فنونِ لطیفہ کی جنّت نگاہ اور فردوسِ گوش کا اسیر بنا لیا ہو۔ انھوں نے علم و عمل کے بڑے صبر آزما اور ہمّت شکن سفر میں بھی نئے نئے راستوں کی نشان دہی کی۔ ان کا دُنیا کے عظیم معلمین کے حلقے میں بھی ایک خاص مقام ہے۔ انھوں نے شانتی نکیتن میں جو تعلیمی تجربے کیے وہ کئی اعتبار سے تعلیمی کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی جامع شخصیت کو لیجیے۔ اس کی زندگی کے تمام

پہلوؤں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور گہرائی ہوتی ہے۔ ٹیگور کی ذات پر یہ بات بالکل صادق آتی ہے۔ ان کا فکر یا فلسفۂ حیات، ان کی شاعری اور تعلیمی نظریے، ان کا سماجی احساس اور سیاسی شعور، ان کا کردار اور عمل، غرض ان کی شخصیت کے سبھی پہلو آپس میں مربوط ہیں اور ایک دوسرے کو اجاگر کرتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ گویا یہ سب الگ الگ مختلف ساز ہیں جو ہم رشتہ ہو کر ایک نغمۂ دل آویز کی شکل میں ڈھلتے ہیں۔

لہٰذا ٹیگور کے تعلیمی نظریات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے فلسفۂ حیات پر نظر ڈالی جائے۔ ٹیگور کے نزدیک کل کائنات ایک ہمہ گیر قوت کی مظہر ہے۔ وہ تمام زمان و مکان میں جاری، طاری اور ساری ہے۔ اسی لیے انھیں ہر شے میں ایکتا اور یگانگت کے اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان، انسان ہو یا حیوان، وہ نباتات کی قسم سے ہو یا جمادات کی۔ انھیں ہر ایک انسان میں، پرند و چرند میں، درخت، پودے پھل پھول میں، کوہسار و دریا میں چاند سورج اور ستارے میں ایک شعاعِ ملکوتی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کے نزدیک ہر چیز قابلِ احترام ہے اور محبت کی مستحق۔ ان کی فطرت پرستی انسان دوستی اور بین الاقوامیت کی اصل بنیاد یہی ہے۔ انھوں نے اپنے گیتوں کا جو ہدیہ "گیتانجلی" کے نام سے پیش کیا ہے، وہ ان کے اسی ادراک اور احساس کا مظہر ہے۔ اس میں ہر جگہ

یہی خیال شاعرانہ وجدان کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ انھیں خدا کے وجود کا ادراک ایسی جگہ ہوتا ہے جسے عموماً ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ان کے ایک گیت میں ہے:

"خدا کی ذات سے آشنائی کرنا چاہتے ہو، تو مسکین نادار اور پامال مخلوق سے قربت حاصل کرو..."

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"حمد و ثنا اور تسبیح کو چھوڑ دو۔ تم مراقبے کے عالم میں اس مندر کے ایک گوشے میں بیٹھے کس سے دھیان لگائے ہوئے ہو؟ آنکھیں کھولو۔ دیکھو تمھارا خدا تمھارے سامنے کہاں ہے!

وہ تو وہاں ہے، جہاں ہل چلانے والا سخت زمین جوت رہا ہے اور جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے۔ وہ ان کے ساتھ چلچلاتی دھوپ اور موسلا دھار بارش میں رہتا ہے۔ اس کا لباس خاک آلودہ ہے۔ تم اپنی پاک صاف عبا اتار پھینکو اور اس کی طرح خاک اور مٹی میں کام کرنے کے لیے آجاؤ....."

اسی لیے ٹیگور کے نزدیک حقیقی عبادت کا مفہوم ہے مخلوقِ خداوندی کی دلجوئی۔ وہ کہتے ہیں:

"میں لوگوں کی خوشی اور غم میں شریک نہیں ہوتا،

اس کے معنی ہیں کہ میں تیری (خدا کی) رفاقت
نہیں کرتا۔ میں اپنی جان کو بچا بچا کے رکھتا
ہوں اور اس حیاتِ جاودانی کے وسیع سمندر
سے ہمکنار ہونے سے محروم رہتا ہوں"۔

اسی طرح ٹیگور دردمندی کو انسانیت کی روح قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک درد آشنا دل کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ ان کے ایک گیت میں تقریباً وہی خیال موجود ہے، جو اقبال کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ٹیگور گو کہ بنیادی طور پر عینیت پسند واقع ہوئے ہیں لیکن ان کی عینیت پسندی اس جہان آب و گل کی مادی حقیقتوں سے فرار کرنے کی ترغیب نہیں دیتی۔ ان کے ہاں من کی دنیا اور تن کی دنیا کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

"میرے نزدیک نجات حاصل کرنے کا طریقہ ترکِ
دنیا نہیں ہے۔ میں سرخوشی کے ہزاروں رشتوں
میں منسلک ہو کر بھی آزادی سے ہم کنار ہونا چاہتا
ہوں"۔

بعض ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی فلسفی ایسے ہیں، جو حقیقت کو ایک جامد اور غیر تغیر پذیر شے سمجھتے ہیں۔ مگر ٹیگور کے ہاں ساری کائنات میں حرکت اور تبدیلی کا قانون کارفرما ہے۔ چنانچہ ان کے

ایک گیت میں ہے:

"تمام چیزیں متحرک ہیں۔ وہ رکتی نہیں ہیں۔ اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں۔ انھیں کوئی قوت آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ وہ ہمیشہ رواں دواں رہیں گی۔"

ٹیگور کے فلسفے کے چند اہم پہلوؤں کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹیگور کے فکر میں جو فطرت پرستی یا انسان دوستی پر اتنا زور ہے وہ دراصل یورپ کی Naturalism اور Humanism کی تحریکوں کا اثر ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ٹیگور کی ادبی تخلیقات اور ان کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے فلسفے کی جڑیں ہندستان کی قدیم تہذیب میں پیوست ہیں۔ وہ درحقیقت ویدانتی فلسفے کے پیرو ہیں۔ البتہ اس میں کچھ شک نہیں کہ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے صحت مند اور توانا عناصر سے وہ متاثر بھی ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ چیزوں کو جانچنے اور پرکھنے میں عقل کی کسوٹی استعمال کرنی چاہیے اور سائنسی نقطۂ نظر کو اپنانا چاہیے۔

ٹیگور نے شانتی نکیتن میں تعلیم کی جو داغ بیل ڈالی، اس میں ان کے فلسفے کی جھلک صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ۱۹۰۱ء میں برہم چریہ آشرم کے نام سے جو مدرسہ قائم کیا اس میں بچے کو فطرت سے قریب لانے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ ان کا یہ

مدرسہ صحیح معنوں میں کھلی ہوا کا مدرسہ تھا۔ بستی کے شوروغوغا اور ہڑبونگ سے دور درختوں کے سایے تلے، باغوں، جھاڑیوں اور کنجوں میں، آزادی اور بے ساختگی کے ماحول میں ٹیگور نے بچوں کی ایک نئی دنیا بسائی اور وہاں ان کے تخیل، تحیّر اور تجسّس کو بروئے کار لانے کے بے شمار مواقع فراہم کیے گئے۔ ٹیگور بچوں کو شروع ہی سے تہذیب و تمدّن کا لبادہ پہنا کر ان کی فطری آزادی اور خوشی نہیں چھیننا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ:

"جو بچہ شہزادے کی طرح پُرتکلف لباس سے مزیّن ہے اور جس کی گردن میں موتیوں کے ہار آویزاں ہیں وہ کھیل کی برجستہ خوشی سے ناآشنا رہتا ہے۔ اس کا لباس ہر قدم پر اس کے پیر کی زنجیریں بن جاتا ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کا لباس میلا نہ ہو جائے، وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہلنے جلنے سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔۔۔۔"

ٹیگور بھی مشہور عرب صوفی شاعر خلیل جبران کی طرح بچوں کی معصومیت اور ان کی آزادی کے بڑے دلدادہ ہیں۔ وہ ایک گیت میں کہتے ہیں:

"کائنات کے لامحدود سمندر کے کنارے بچے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ ریت سے اپنے گھروندے بناتے ہیں۔ اور خالی گھونگوں سے کھیلتے

ہیں۔ وہ مرجھائی ہوئی پتیوں سے کشتیاں بناتے
ہیں۔ اور انھیں وسیع اور اتھاہ سمندر میں
تیرا کر خوش ہوتے ہیں...... وہ (تاجروں
کی طرح) سمندر کے پوشیدہ خزانے حاصل کرنے
کی جستجو نہیں کرتے...... وہ جال پھینکنا نہیں
جانتے۔"

چنانچہ شانتی نکیتن کی آزاد فضا میں ٹیگور نے بچوں کو قدرت سے ہم آہنگ ہونے، اس سے سیکھنے اور خوشی حاصل کرنے اور لطف اٹھانے کے خاطر خواہ مواقع فراہم کیے۔ ٹیگور کا خیال تھا کہ مدرسے کے کمرے جو دیواروں اور چھتوں سے گھرے ہوتے ہیں، بچوں کے تخیل، اپج اور اٹھان کو محدود کر دیتے ہیں اور کھلی جگہ میں بچوں کے لیے نہ صرف جسمانی لحاظ سے چلت پھرت کی بے حد گنجایش ہے بلکہ ان کی ذہنی وسعت اور روحانی ترقی کے بے شمار مواقع ہیں۔ اس طرح ان کے جسم، روح اور عقل کی متوازن نشو و نما ہوتی ہے اور ان کی زندگی کُل کائنات کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے کہ تعلیم کا اعلیٰ مقصد یہی ہے۔ روسو کی طرح ٹیگور نے بھی ذکر کیا ہے کہ رابنسن کروسو کے سوانح حیات بچوں کے لیے نہ صرف دل چسپی کا باعث ہیں بلکہ آدرش ثابت ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کو قدیم ہندستان کے روایتی تعلیمی ادارے گروکل میں ملک کی تعلیمی نجات کا سامان دکھائی دیا اور انھوں نے اسی قسم کی ایک درس گاہ شانتی نکیتن میں قائم کرنے کی کوشش کی جیسا کہ پہلے کہا

جا چکا ہے۔

مگر اس بیان سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ٹیگور روسو کی طرح بچے کو سماجی اثرات اور باضابطہ تعلیم سے بچانا چاہتے تھے۔ ٹیگور جہاں فطرت کے پرستار ہیں، وہاں وہ سماج کے بھی قائل ہیں۔ ان کا قول ہے کہ "کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جسمانی طور پر تو وحشی ہوں لیکن ذہنی لحاظ سے مہذب اور شائستہ ہوں۔ ہم میں یہ دونوں صلاحیتیں بیک وقت ہونی چاہییں کہ فطرت کے ساتھ فطری انداز میں پیش آسکیں اور انسانی سماج میں تمام انسانی آداب کی پابندی کرسکیں۔"

ٹیگور کے نزدیک تعلیم میں آزادی اور کھیل کود کی بنیادی حیثیت ہے۔ وہ تعلیم کے اس پہلو پر اتنا زور دیتے تھے کہ انھیں بنیادی قومی تعلیم کے خود کفالتی بنائے جانے پر نکتہ چینی کرنی پڑی۔ گاندھی جی کی تجویز تھی کہ بنیادی مدرسے میں بچوں کے ہاتھ کے کام سے اتنی آمدنی ہو جانی چاہیے کہ اس سے استاد کی تنخواہ ادا کی جاسکے۔ ٹیگور کو یہ تجویز نامناسب معلوم ہوئی اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے اس پیغام میں کیا، جو انھوں نے کلکتے میں ہونے والی ۱۹۳۷ء کی کل ہند تعلیمی کانفرنس کے موقع پر دیا تھا۔ وہاں انھوں نے کہا "... میں اس سماج یا قوم کو مبارکباد نہیں دے سکتا، جو اطمینان کے ساتھ بیشتر بچوں کے نصاب تعلیم سے کھیل کود کو خارج کر دے اور اس کی جگہ استادوں کو خود غرضی کی ترغیب دے کہ وہ بچوں کی محنت کو بازار میں بیچیں۔"

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ٹیگور تعلیم میں جسمانی محنت و مشقت اور نفع بخش کام کے مخالف تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ بچّے کی آزادی، خوشی اور اس کے کھیل کود کے حق کو کسی قیمت پر قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے خود اپنے مدرسے میں بچّوں کے لیے مطالعۂ قدرت، آرٹ، سنگیت وغیرہ مضامین کے ساتھ ساتھ حرفے کا کام بھی تجویز کیا تھا۔ لیکن ان کے نصاب تعلیم میں حرفہ آمدنی کا ذریعہ نہیں بلکہ اظہار ذات کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا کہ بچے مختلف خام اشیا کا استعمال کر کے خوبصورت چیزیں بنائیں اور وہ اُن کی اپنی تخلیقی قوت اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا ذریعہ بنیں۔ ابتدائی تعلیم کی منزل ختم کرنے کے بعد نوجوانوں اور بالغوں کی تعلیم میں ٹیگور نے محنت و مشقت اور سماجی خدمت کے کام پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کو عوام کی زندگی کے دھارے سے باہر نہیں نکالنا چاہیے بلکہ ہمیں عملی صنعتی تربیت اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت کی طرف مدرسہ اور سماج میں دونوں جگہ دھیان دینا چاہیے اور ایسے پروجیکٹ چلانے چاہییں۔ جن سے عوام کی اقتصادی، اخلاقی اور جسمانی حالت بہتر بنائی جا سکے۔

دوسری بڑی چیز جس پر ٹیگور نے تعلیم میں بہت زور دیا ہے وہ ہے تخلیقی اظہار ذات کے مواقع فراہم کرنا۔ ان کا قول ہے انسان اپنی شخصیت کے ایک بڑے حصّے کا اظہار محض الفاظ کے ذریعے نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی اور زبان تلاش کرنی پڑے گی — نقوش اور رنگ، حرکت اور آہنگ یعنی اس غرض سے تعلیم میں آرٹ، ناچ اور سنگیت وغیرہ کا التزام کرنا پڑے گا تاکہ شخصیت

کے ان پوشیدہ جواہر کو جِلا دی جا سکے، جن کے اظہار کے لیے زبان کا وسیلہ ناکافی اور ناموزوں ہے۔ ٹیگور کے ہاں اس کی ضرورت صرف اس لیے نہیں کہ اس سے فرد کو اپنی جگہ تسکین حاصل کرنے کا سہارا مل جائے گا بلکہ اس لیے کہ اس کے ذریعے اس عظیم قوت کا جلوہ منظرِ عام پر آئے گا جو کائنات کی ہر شے میں موجود ہے۔

ٹیگور کے نظریۂ تعلیم کا تیسرا اہم عنصر بین الاقوامیت ہے۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر ویدانتی فلسفے کے پیرو ہیں، اس لیے بلا امتیاز رنگ و نسل، قوم و ملت، دین و مذہب وہ تمام نوعِ انسانی کا احترام کرتے ہیں اور وہ سیاسی تنگ نظری یا مذہبی تعصب کی بنا پر کسی قوم یا جماعت سے نفرت تو درکنار مغائرت کو بھی روا نہیں رکھتے۔ اسی قسم کی ہستیوں کی ترجمانی جگر نے اس شعر میں کی ہے ؎

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ٹیگور کے نظریۂ بین الاقوامیت کی تہ میں اُن کا فلسفہ تو تھا ہی، لیکن اُس کو مزید تقویت ان حالات نے پہنچائی، جو ہندستان اور دنیا میں اس صدی کے اوائل میں رونما ہوئے۔ انھوں نے ایک طرف ہندستانیوں کی غلامی اور تباہی بہت شدت سے محسوس کی جو برطانوی سامراج اور انگریزی قومیت کی جارحانہ حکمتِ عملی کا نتیجہ تھی۔ دوسری طرف انھوں نے یورپ اور امریکا کے سفر کے دوران پہلی جنگِ عظیم کے اثرات کا مطالعہ کیا۔ اس سے انھیں یقین ہو گیا کہ تنگ نظر قوم پرستی یا قومی تنگ نظری بہت

بڑے خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انھیں اعلیٰ تعلیم کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہیے جس کی بنیاد بین الاقوامیت کے وسیع تصور پر قائم ہو۔ وشو بھارتی اسی خیال کی عملی شکل ہے۔

وہ کہتے ہیں:

"انسانی نسلوں میں واقعی چند امتیازات پائے جاتے ہیں۔ ان امتیازات کو قائم رکھنا چاہیے۔ ان کا احترام کرنا چاہیے۔ تعلیم کا فریضہ یہ ہے کہ ان اختلافات کے باوجود انسانی یک جہتی کو استوار کرے اور (ظاہری) تضاد کے ویرانے میں سے سچائی کو ڈھونڈھ نکالے۔"

چنانچہ وشو بھارتی میں اسی مقصد کے پیش نظر مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کے مطالعے کا انتظام کیا گیا تاکہ مختلف قوموں کے ادبی، مذہبی اور فلسفیانہ کارناموں کا صحیح احساس پیدا کیا جا سکے۔

ٹیگور کے نزدیک بین الاقوامیت اور قومیت کے تصور میں کوئی لازمی ٹکراو نہیں۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر ان کا مسلک انسان دوستی ہے۔ اس کا اظہار جتنے موثر انداز میں ان کی مشہور نظم "آزادی" میں کیا گیا ہے ویسا شاید ہی کہیں اور ملے گا۔ اس کے بعض حصے بطور مثال ملاحظہ ہوں:

"جہاں دل خوف و ہراس سے پاک ہے اور سر بلند

ہے.... جہاں چھوٹی چھوٹی مقامی، دیواروں کے
ذریعے دنیا کو الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹا نہیں
گیا ہے۔
جہاں الفاظ سچائی کی گہرائی سے نکلتے ہیں۔
جہاں مسلسل جد و جہد کمال کی جانب ہاتھ پھیلاتی
ہے.... ایسی فردوسِ آزادی میں اے میرے
مولا میرے ملک کو بیدار کر۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹیگور نے شانتی نکیتن میں تعلیم کا جو راگ چھیڑا، وہ در اصل یورپ اور امریکا کی اس تعلیمی تحریک کی گونج ہے جس میں بچّے کو مرکزی جگہ دی گئی ہے اور جسے اصطلاح میں ترقی پسند تعلیم Progressive Education کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور کے تعلیمی تجربے اور ترقی پسند تعلیم میں کئی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً ٹیگور نے تعلیم میں بچّے کی انفرادیت پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی خوشی اور آزادی کو بنیادی قرار دیا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ترقی پسند تعلیم میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر ٹیگور کو ترقی پسند تعلیم کے بعض عناصر سے اختلاف ہے۔ مثلاً انھوں نے بچّے کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کی کبھی تلقین نہیں کی جیسا کہ بعض ترقی پسند تعلیم کے مبلغوں کا خیال ہے۔ اور نہ ہی انھوں نے اسے سماجی زندگی کی ضرورتوں سے بے نیاز رکھنے کی اجازت دی ہے۔ وہ انفرادیت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ بچّے میں سماجی احساس اور جماعتی شعور پیدا کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور اس

مقصد کے حصول کے لیے تعلیمی ماحول کو مناسب انداز میں منظم اور مرتب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مغربی ممالک کی انفرادیت جو دراصل نظام سرمایہ داری کی دین ہے، اور جس کی بنیاد خودغرضی، مقابلہ اور باہمی تصادم پر قائم ہے، ٹیگور کو ناقابلِ قبول ہے۔ ٹیگور کے نزدیک انفرادیت کا سرچشمہ خود آگہی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان دیتا زیادہ ہے اور لیتا کم ہے۔ جہاں وہ دوسروں کی ٹانگ کھینچ کر خود آگے ہو جانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ کندھے سے کندھا ملا کر چلتا ہے۔ اور سب کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ اور جہاں اس کی اپنی صلاحیت پورے سماج کے لیے ایک نعمت بن جاتی ہے۔ ٹیگور کے نظریۂ تعلیم کا یہ فرق معنوی لحاظ سے اسے مغربی ممالک کی نام نہاد ترقی پسند تعلیم سے ممتاز بناتا ہے۔

۲۴- بچوں کے ادیب - اسماعیل

بہت سے لوگ ہوں گے جو شاعری کی دنیا میں سب سے پہلے مولانا اسماعیل میرٹھی سے روشناس ہوئے ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب میں نے شاید تیسری جماعت میں مولانا کی نظم "کچھوا اور خرگوش" پڑھی تھی تو مجھے اس میں کیسا مزا آیا تھا۔ اُس وقت اتنی تو کچھ بوجھ تھی نہیں کہ شعر کی اچھائی اور بُرائی میں تمیز کر سکتا لیکن اُس نظم میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ اتنی بار پڑھا کر پوری نظم ازبر ہو گئی۔ اور یہ صرف میری ہی کیفیت نہیں تھی بلکہ میرے سب ہی ہم جماعت خوش ہو ہو کر نظم کو دہرایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم اپنے طور پر کچھوے اور خرگوش کے مکالمے اس طرح ادا کرتے کہ ایک کچھوا ہے دوسرا خرگوش۔ اسی طرح مولانا کی بعض دوسری نظمیں ہمارے لیے بے حد دلچسپ تھیں کہ ہم اُنھیں جتنا زیادہ پڑھتے اتنا ہی مزا آتا۔

آخر اس کا راز کیا ہے کہ مولانا کی نظمیں ہی نہیں ان کے نثری مضامین بھی بچوں کو عموماً پسند آتے ہیں۔ آج بھی اُردو کی کسی ریڈر

کی ورق گردانی کیجیے تو اُس میں مولانا کی تخلیقی صلاحیت کے نمونے ملیں گے بچے آج بھی انھیں خوشی سے پڑھتے ہیں۔ مولانا کی تحریریں بچوں کے لیے اتنی جاذب کیوں ہیں؟ ان کی مقبولیت کا کیا راز ہے؟

یہ معلوم کرنے کے لیے مولانا کے تخلیقی سرمایے کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی فن کار کے کارنامے کی ٹھیک طرح سے جانچ اور پرکھ صرف اسی حالت میں کی جا سکتی ہے کہ جب ہم اس کی شخصیت کو سمجھیں کیونکہ فن دراصل آئینہ دار ہوتا ہے اپنے فن کار کی شخصیت کا۔ ادیب اپنی نگارشش میں اپنا ہی رنگ روپ بھرتا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل انیسویں صدی کی اُس تعلیمی اور تہذیبی تحریک سے بہت متاثر ہوئے، جس کے علمبردار سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی اور اُن کے دیگر رفقائے کار تھے۔ یہ تحریک پیداوار تھی اُن تاریخی حالات کی جو ملک میں بیرونی حکومت کے اقتدار کے استحکام سے رونما ہوئے تھے۔ ہندستانیوں کی سیاسی محکومی کا نتیجہ اقتصادی بدحالی اور تہذیبی پستی کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا اور لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ یکایک ۱۸۵۷ء میں ملک میں بیرونی استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک ہلچل ہوئی جسے غدر کا نام دیا گیا۔ دراصل یہ ہلچل ایک عام بے چینی اور غصے کا مظہر تھی۔ مگر اس میں ملک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُس کے بعد حکومت نے اور زیادہ تشدد آمیز پالیسی اختیار کی۔ یوں تو اس کی چوٹ عموماً سبھی ہندستانیوں پر پڑی لیکن خصوصاً مسلمان اس کا نشانہ بنے۔ قوم کی اس بے بسی کے عالم میں جہاں ایک طرف

آزادی کی ایک منظم تحریک شروع ہوئی وہاں دوسری طرف سماجی اصلاح کی کئی ایک تحریکیں وجود میں آئیں۔ بعض دوررس نگاہوں نے دیکھا کہ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے تعلیمی اور تہذیبی لحاظ سے سربلند کیا جائے۔ چنانچہ اس عہد میں تعلیم اور تہذیب کے میدان میں کئی مؤثر قدم اٹھائے گئے۔ اُن اقدامات کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مشرق کی اُن فرسودہ روایات کو ترک کیا جائے، جو قومی ترقی کی راہ میں عرصے سے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اور مغرب کی نئی تہذیب کے ان صحت مند عناصر کو اپنایا جائے جن کی بدولت قوم اس دنیا میں خوش حال اور سرخ رُوئی حاصل کر سکے۔ مگر اس رد و قبول کے عمل میں اس بات کا بہرکیف خیال رکھا جائے کہ مشرقی تہذیب کے محاسن نہ صرف اپنی جگہ قائم رہیں۔ بلکہ پروان چڑھیں۔ گویا قدیم اور جدید میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے کہ قدیم کے خدوخال جدید کی روشنی میں اجاگر ہوں اور ایک ایسی تہذیب کی تشکیل ہو جس میں مشرق کی روحانی بصیرت کے ساتھ ساتھ مغرب کی سائنسی نظر کا عمل دخل ہو، جو روحانی اقدار اور مادی امکانات دونوں کی بیک وقت حامل ہو۔ غرض ایک ایسی تہذیب کا نشوونما مقصود تھا جس کی جڑیں تو اپنے ماضی کی حیات بخش سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ پیوست ہوں، مگر اُس کے پھول اور پھل حال کی تازہ ہوا اور روشنی سے خوش رنگی اور توانائی حاصل کر سکیں۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور تہذیب کے میدان میں جس تحریک کی داغ بیل ڈالی اُس

میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

مولانا اسمٰعیل اس تحریک میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے لیے تعلیم اور ادب کا میدان منتخب کیا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ مولانا کی شخصیت پر نظر ڈالیے تو وہ خود اس تحریک کے ایک سچے نمایندہ ہیں۔ ان کی ذات میں جذبۂ روحانی اور سائنسی کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ مولانا نے بچپن میں گھر ہی پر تعلیم حاصل کی۔ گھر کی تربیت میں حسب دستور مذہبی رنگ غالب رہا۔ پھر انھیں حضرت مولانا سید غوث علی شاہ جیسے بزرگ سے دولت باطنی نصیب ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وسیع القلبی کی اس راہ پر گامزن ہوئے جس کی منزل پر پہنچ کر اپنے اور پرائے، چھوٹے اور بڑے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ صحیح معنوں میں یہی انسان دوستی کی منزل ہے، اس طرح مولانا کی شخصیت اخلاقی اقدار سے مالا مال ہوئی۔ دوسرے انگریزی تعلیم نے انھیں زندگی کو دیکھنے کا سائنسی نقطۂ نظر عطا کیا اور اس کی بدولت ان میں مشاہدے اور تجربے کا سلیقہ پیدا ہوا کہ یہی چیزوں کی حقیقت کو پرکھنے اور جانچنے کی سچی کسوٹی ہیں۔ مولانا نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس میں وہ جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ انگریزی کی سادہ اور سلیس شاعری ہے۔

مولانا کی ادبی نگارشات میں ان کی شخصیت کے یہ سبھی رنگ جھلکتے ہیں۔ قدرت اور انسانی زندگی کا انھوں نے بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کا رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

دعوئ بے دلیل اور توہم پرستی کے مخالف ہیں۔ اُن کی شاعری میں اس کی جا بہ جا مثالیں ملتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں اخلاقی اقدار کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ نظم ہی میں نہیں اُن کی نثر میں بھی اس کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ مولانا نے بچّوں اور بڑوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اس میں سائنسی اور اخلاقی پہلو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آیئے، اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ مولانا محمد اسماعیل نے چھوٹے اور بڑے بچّوں کے لیے جو ادب تخلیق کیا ہے، وہ اتنا مقبول کیوں ہے۔ مولانا اپنی ریڈروں کے دیباچے میں خود فرماتے ہیں:

"اوّل یہ کہ تفنّنِ طبع اور تفریحِ خاطر کی تا بمقدور رعایت کی گئی ہے، جو طلبا کے حق میں مشقت مطالعہ کا ایک نقد صلہ اور شغل درس کو دل آویز بنانے میں نہایت موثر ہے۔ چنانچہ مطالب و مضامین کی رنگا رنگی، ان کا نتیجہ خیز ہونا اور مختلف اوزان کی اقسامِ نظم، ان سب کا مجموعی اثر غالباً طلبا کی طبیعت کے لیے کافی موجباتِ ترغیب ہے۔"

"دوم، یہ کہ ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کا ماخذ و منشا چونکہ مختلف علوم و فنون ہیں۔ مثلاً امثال و قصص، اخبار و سیر، آداب و اخلاق، تواریخ طبعی، تشریحِ ابدان، فزیالوجی، حفظانِ صحت، اصول فلاحت، علم انتظام وغیرہ۔ لہٰذا یہ توقع کچھ بے محل نہیں ہے کہ اُن کا مطالعہ عقلی اور اخلاقی تربیت کا معاون اور واقفیت عامہ کی توسیع کا ممد ہوگا۔"

واقعی مولانا کے مضامین، قصے، کہانیاں، نظمیں وغیرہ پڑھ کر بچے مندرجہ بالا مقاصد بخوبی حاصل کر سکتے ہیں، کیوں کہ یہ چیزیں بچوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ مولانا نے بھلے ہی علم نفسیات کا باضابطہ مطالعہ نہ کیا ہو۔ لیکن انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے بچوں کی دلچسپیوں، ضرورتوں، رجحانوں اور صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے۔ بچے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے منزل بہ منزل کیوں کر ترقی کرتے ہیں۔ کسی خاص عمر کے بچوں کو کون کون سی چیزیں اپیل کرتی ہیں اور نشو و نما کی کسی مخصوص منزل پر اُن میں کس درجہ سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چھ سات برس کے بچوں کے لیے مولانا نے جانوروں کی کہانیاں یا نظمیں لکھی ہیں، جن میں اس عمر کے بچے فطری طور پر دل چسپی لیتے ہیں۔ ان کی عبارت اتنی سادہ اور آسان ہے اور اندازِ بیان اتنا دل کش ہے کہ بچے انھیں بار بار پڑھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں اور نظموں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی نکتہ ضرور ہوتا ہے اور وہ ایسے عمدہ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے کہ دل نشین ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر مولانا کی نظمیں بحر اور ترنم کے لحاظ سے بچوں کے لیے بہت موزوں ہیں۔ مثلاً 'ہماری گائے' اسی قسم کی ایک دلچسپ نظم ہے۔ کہیں کہیں مولانا بچوں کی جبلت، تجسس اور جذبۂ تحیّر کو بہت کامیابی سے اُکساتے ہیں۔ وہ موضوع کو پہیلی کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ بچے اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور پڑھنے کے

ساتھ ساتھ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ کس چیز کے بارے میں ہے۔ جب اختتام پر پہنچتے ہیں تو جواب معلوم ہوتا ہے۔ "عجیب چڑیا" اسی قبیل کی نظم ہے۔ "ریل گاڑی" کی نظم میں بھی کسی حد تک یہی خوبی پائی جاتی ہے۔

مولانا اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کے تخیل کو بیدار کرتے ہیں، اور انھیں زندگی کے حسن و قبح سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن اُن میں واعظ کی تلخ کلامی نہیں، بلکہ شاعر کی شیریں بیانی ہے۔ وہ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ بالقصد نصیحت کر رہے ہیں۔ اسی لیے ان کی بات دل میں اتر جاتی ہے۔ اپنا پیغام کبھی براہ راست نہیں پہنچاتے بلکہ کسی کہانی چٹکلے یا حکایت کا سہارا لیتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے نقطۂ نظر سے تعلیم و تربیت کا یہ بہت مؤثر طریقہ ہے۔ مولانا نے اس قسم کی متعدد نظمیں لکھی ہیں جن میں سے چند مشہور نظموں کے عنوانات یہ ہیں:

بارش کا پہلا قطرہ، ناقدردانی، کچھوا اور خرگوش، دو مکھیاں اور کلنگ، ایک پودا اور گھاس، ایک جگنو اور بچے کی باتیں، ایک گھوڑا اور اس کا سایہ، دال کی فریاد، ملمع کی انگوٹھی، صبح کی آمد، چھوٹی چیونٹی۔

بچوں کے لیے مولانا اسماعیل نے جس پائے کا ادب تخلیق کیا ہے اُسے سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ وہ اس صنعت کے ادیبوں کے امام ہیں۔

مولانا کے زمانے تک اکثر ادیب یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کے لیے کسی

خاص ادب کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ جو چیزیں بالغوں کے لیے لکھی جاتی ہیں، اُن کو ذرا آسان عبارت میں لکھ دیا جائے تو وہی بچّوں کے کام آسکتی ہیں۔ مولانا نے سب سے پہلے بچّوں کے ادب کو ایک مخصوص صنعت ادب کا درجہ عطا کیا' اسے اپنی ذہنی صلاحیت اور فنی مہارت کے شایانِ شان گردانا اور اس میں اپنی ذات کو پوری لگن کے ساتھ کھپایا۔ انھوں نے بچّوں کے لیے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ آج بھی مقبول ہے۔ اردو زبان میں شاید ہی بچّوں کی کوئی ایسی ریڈر ہوگی' جس میں مولانا کی کوئی کہانی یا نظم نہ ہو۔ اسے مولانا کے فن کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اب تک بچوں کا کوئی ایسا ادیب بمشکل نظر آیا ہے' جو اس بلندی کو چھو سکا ہو' جسے مولانا اسماعیل نے حاصل کیا تھا۔

۲۵۔ بچّوں کے شاعر۔ محروم

ہمارے دیس میں تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن میں سے ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں کے لیے معقول لٹریچر اور درسی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ یہ کمی ابتدائی تعلیم کی منزل پر شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں تقریباً سبھی مضامین پر اچھی کتابیں ہمارے ہاں مل جاتی ہیں مگر وہ ہمارے طلبہ کے کچھ زیادہ کام کی نہیں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر تو شاید ہمارے کالجوں کے طالب علم انگریزی کتابوں سے کچھ تھوڑا بہت فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے طلبہ کے لیے انگریزی کتابیں بالکل بے کار ہیں۔ مادری زبان کے سوا دوسرے مضامین میں اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی اور دوسری زبانوں کی اچھی کتابیں ترجمے اور تالیف کے ذریعے ہندوستان کی زبانوں میں منتقل ہو جائیں۔ مگر مادری زبان کی

تعلیم کے لیے یہ طریقہ بوجوہ نہیں اپنایا جا سکتا۔ چنانچہ ملک کی ہر ایک زبان کی تعلیم کے لیے خود اپنا اپنا لٹریچر تیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اُردو میں بھی اس مسئلے پر کچھ عرصے سے قدرے توجہ دی جانے لگی ہے۔

یوں تو اُردو کے تقریباً سبھی چوٹی کے ادیبوں کی کوئی نہ کوئی تخلیق ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر ایسی بہت کم چیزیں ہیں جن پر صحیح معنوں میں بچوں کے لٹریچر کا اطلاق ہو سکے۔ نظیر اکبرآبادی، حالی اور اقبال کا شمار اردو کے ممتاز ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی چند نظمیں واقعی ایسی ہیں جو مدرسۂ ابتدائی اور مدرسۂ ثانوی کے طلبہ کے ذہنی معیار اور دلچسپی کے مطابق ہیں یا نثر میں ڈاکٹر نذیر احمد اور سر سید احمد خاں کی بعض نگارشات یقیناً بچوں اور نوجوانوں کے لٹریچر میں ایک اعلیٰ مقام کی مستحق ہیں لیکن اس قسم کا لٹریچر بہت محدود اور ناکافی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بچوں کے ادب کے معاملے میں ابھی اُردو کا دامن بہت تنگ ہے۔

اس صورتِ حال کا جائزہ لیجیے تو کئی ایک چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں بہت عرصے تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے کسی خاص قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھا جاتا رہا کہ وہ ادب جو ماضی سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی

تعلیم کے لیے بھی موزوں ہے اور اُسے جستہ جستہ مناسب طریقوں سے ان کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ گویا اس خیال کے بموجب تعلیم میں موضوع یا موادِ تعلیم کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ طریقۂ تعلیم کی، اور اگر مناسب طریقۂ تعلیم ڈھونڈ نکالا جائے، تو ہمارا تمام ادبی سرمایہ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے ایک بنیادی اصول کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جو چیز سکھائی جائے وہ سیکھنے والے کی ذہنی پختگی کے مطابق ہونی چاہیے۔ علم نفسیات کی رو سے دیکھیے تو ذہنی نشو و نما ایک تدریجی عمل ہے۔ بچپن سے بلوغت تک ذہن برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وہ باتیں جو بچّوں کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں، انھیں بالغ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ جو لوگ اس کلیے کو جانتے ہیں۔ ان میں بھی بعض اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر آسان زبان میں کوئی چیز بیان کردی جائے تو اُسے بچّے ضرور سمجھ لیں گے۔ مگر یہ بات پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ کسی خاص عمر کے بچّے کسی چیز کو ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں یا نہیں، اس کا انحصار صرف زبان کے آسان یا مشکل ہونے پر نہیں بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ وہ چیز معنوی لحاظ سے اُن بچوں کے لیے قابلِ فہم ہے یا ان کی فہم سے بالاتر۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں کوئی ایسی تحقیق نہیں ہوئی ہے جس کی روشنی میں یقینی طور پر کہا جاسکے کہ کس

عمر کے بچّوں کے لیے کون سے الفاظ قابلِ فہم ہوتے ہیں۔ بعض مغربی زبانوں میں تحقیق کی بنیاد پر ایسی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں، جن سے بچّوں کے لیے لکھنے والے استفادہ کر سکتے ہیں کہ کسی خاص عمر کے بچّوں کے ادب میں کون سے الفاظ استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اس طرح بچّوں کی درسی کتابوں کا جو سلسلہ تیار کیا جاتا ہے وہ بچّوں کے لیے موزوں اور مفید ثابت ہوگا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اردو کے نامور ادیبوں میں سے ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے لیے بچّوں کے ادب کو قابلِ اعتنا سمجھا ہو۔ اکثر ادیب بچّوں کے لیے لکھنا اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ بعض کا خیال ہے کہ بچّوں کی شاعری محض تک بندی ہے۔ شاعری کے اعلیٰ محاسن سے اُس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چنانچہ جسے تھوڑی بہت بھی ردیف و قافیے کی شُد بُد ہو، وہ بہ زعمِ خود "بچّوں کا شاعر" ہونے کا اعلان کر سکتا ہے۔ دراصل بچّوں کی شاعری کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ بچّوں کی شاعری بھی بڑوں کی شاعری کی طرح شعری خوبیوں سے آراستہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی آمد کا ہونا ضروری ہے۔ اُس کے لیے بھی تشبیہ و استعارہ اور دوسری صنائعِ سخن کی چاشنی درکار ہے۔ وہ بھی شاعر کی قوتِ تخیّلہ کی محتاج ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ بچّوں کی شاعری اُس پائے کی ہونی چاہیے کہ اس کا صحیح ادراک بچّوں کو ہو سکے، اور اُسے سراہنے کے لیے جس قسم کی صلاحیت کی ضرورت ہے وہ بچّوں میں نشوونما پا چکی ہو۔

اگرچہ اردو میں بچوں کے لٹریچر کی تیاری سے متعلق اب تک کوئی منظم اور موثر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ پھر بھی ہمارے بعض ادیبوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور تجربے کی بنا پر بالخصوص بچوں کے لیے نظم اور نثر دونوں میں کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں، اور وہ بچوں کی درسی اور امدادی کتابوں میں داخل کی گئی ہیں۔ اس میدان میں جو شعوری کوششیں ہوئی ہیں ان میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کی ترتیب دی ہوئی درسی کتابوں کا سلسلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ایک بڑی مدت تک اردو کے نصابِ تعلیم میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں ان ہی کا بول بالا رہا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کے علاوہ جن حضرات نے بچوں کے ادب میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ شاعر تلوک چند محروم بھی ہیں۔ ان کی نظمیں بچوں کی درسی اور امدادی کتابوں میں ایک مدت سے شامل کی جاتی رہی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں محروم کی ایسی ہی کچھ نظموں کا مجموعہ "بہارِ طفلی" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شایع ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی بچوں کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چھاپا گیا۔ اس کا نام "بچوں کی دنیا" ہے۔

محروم کا شمار اردو کے ان چند مشہور شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے معلمی کو بطورِ پیشہ اپنایا، اور اس کی آبرو کو اپنی پرخلوص محنت اور تخلیقی صلاحیت سے بڑھایا۔ معلم کی حیثیت سے محروم کو بچوں کی نفسیات اور ضروریات کا قریب

سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ انھوں نے جو نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں اُن میں محروم کے اس تجربے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں کو پڑھیے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے سامنے بچوں کی ایک جماعت ہے اور وہ اس سے مخاطب ہیں۔

محروم کی نظموں میں بچوں کی اخلاقی تربیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ یوں تو نئی تعلیم میں براہِ راست پند و نصائح کو کچھ زیادہ مؤثر نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیزیں بار بار دُہرائی جاتی ہیں ان کا دل و دماغ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔

محروم کی نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان ستھری اور سلیس ہے۔ اندازِ بیان سیدھا سادہ ہے۔ مصرعوں میں روانی ہے۔ موضوع صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ان نظموں کو بچے ترنم کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی لَے اور دُھن آسان ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی دی ہوئی ہے جس میں تمام نظموں کے مشکل الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ بچے اس کی مدد سے خود نظم سمجھ سکتے ہیں۔ اُنھیں کسی شخص کی مدد کی ضرورت نہیں۔

اس مجموعے میں چند نظمیں مظاہرِ فطرت سے متعلق ہیں، جن سے شاعر کے مشاہدے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے کیسی گہری نظر سے اُن چیزوں کو دیکھا ہے، اور اُن سے کیا اثر قبول کیا ہے۔ ان نظموں میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال

کیے گئے ہیں، ان سے بچوں کی قوتِ متخیلہ فروغ پائے گی۔

غرض، محروم کی نظمیں بچوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ امید ہے کہ محروم کی شاعری بچوں کی دنیا میں قدر و تحسین کی نظر سے دیکھی جائے گی اور بچے اس سے خاطر خواہ لطف اندوز ہوں گے۔

مصنف: علی سردار جعفری

صفحات: 112

قیمت:-/54 روپئے

مصنف: محمد اکرام خاں

صفحات: 124

قیمت:-/56 روپئے

مصنف: محمد عبد السلام

صفحات: 388

قیمت:-/120 روپئے

مصنف: ضیاء الحسن فاروقی

صفحات: 88

قیمت:-/48 روپئے

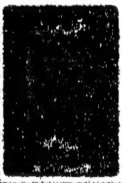

مصنف: عبد القوی دسنوی

صفحات: 152

قیمت:-/63 روپئے

مصنف: صالحہ عابد حسین

صفحات: 112

قیمت:-/54 روپئے

مرتب: رشید حسن خاں

صفحات: 208

قیمت:-/64 روپئے

مصنف: خواجہ احمد عباس

صفحات: 176

قیمت:-/58 روپئے

ISBN 978-81-7587-505-0

₹ 83/-